جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

علمی دینی اور اصلاحی مجلہ

# انوارِ مدینہ

لاہور

بیاد

عالمِ ربانی محدثِ کبیر حضرۃ مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ

بانی جامعہ مدنیہ

نگران

مولانا سید رشید میاں مدظلہ

مہتمم جامعہ مدنیہ، لاہور

دسمبر سنہ ۱۹۹۴ء

رجب المرجب سنہ ۱۴۱۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

# انوارِ مدینہ

جلد : ۳ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ ۔ دسمبر ۱۹۹۴ء شمارہ : ۳

مدیر

**سیّد محمود میاں**

مدرّس و نائب مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

بدلِ اشتراک

پاکستان فی پرچہ ۱۰ روپے . . . . سالانہ ۱۱۰ روپے

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات . . . " ۴۵ ریال

بھارت، بنگلہ دیش . . . . . . " ۱۰ امریکی ڈالر

امریکہ افریقہ . . . . . . . . " ۱۶ ڈالر

برطانیہ . . . . . . . . . " ۱۷ ڈالر

○ اس دائرہ میں سُرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ ماہ . . . . . سے آپ کی مُدّتِ خریداری ختم ہوگئی ہے، آئندہ رسالہ جاری رکھنے کے لیے مبلغ . . . . . . . . . ارسال فرمائیں۔

ترسیلِ زر و رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ "انوارِ مدینہ" جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور۔ کوڈ ۵۴۰۰۰، فون ۲۰۱۰۸۶ - ۲۰۹۰۵۲

سیّد رشید میاں طابع و ناشر نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "انوارِ مدینہ" جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔

## اِس شمارے میں


حرفِ آغاز ـــــــــــــــــــــــــــــــــــ ۳
درسِ قرآن ـــــــ حضرت مولانا قاری محمد طیب ؒ ـــــ ۵
درسِ حدیث ـــــــ حضرت مولانا سید حامد میاں ؒ ـــــ ۱۰
سیرۃِ مُبارکہ ـــــــ حضرت اقدس مولانا سید محمد میاں ؒ ـــــ ۱۴
فضیلت کی داتیں ـــــــ مولانا نعیم الدین صاحب ـــــ ۲۰
سادات و علویین ـــــــ مولانا سید ریاست علی مرحوم ـــــ ۳۲
خلافت معاویہ رضؓ ـــــــ مولانا مجاہد الاسلام القاسمی ـــــ ۳۷
دارالافتاء ـــــــ مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب ـــــ ۵۷
اعتراف ـــــــ مولوی انیس احمد ـــــ ۶۱
تقریظ و تنقید ـــــــــــــــــــــــــــــــــــ ۶۳



رابطہ: دفتر کراچی

حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب مدظلہٗ، خطیب جامع مسجد سٹی اسٹیشن کراچی

انڈیا میں رابطے کے لیے

حضرت مولانا سید رشید الدین صاحب حمیدی مدظلہ العالی مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حرفِ آغاز

سیّد محمود میاں

نحمدہ نصلی علی رسولہ الکریم۔

امابعد! اللہ تعالیٰ نے انسان کو دُنیا میں ایک خاص مقصد کے تحت بھیجا ہے اس کو اپنا نائب بنایا اور راہنمائی کے لیے انبیائے کرام بھیجے جنہوں نے اللہ کی طرف سے انسان کی ابدی فلاح کا دستور بندوں کو سکھایا تاکہ اس پر عمل کر کے دُنیا میں بھی امن و راحت کے ساتھ زندگی گزاری جا سکے اور موت کے بعد ختم نہ ہونے والی زندگی کا مزہ بھی دوبالا ہو۔

دُنیا میں اس وقت جو بے چینی و اضطراب پایا جا رہا ہے اس کی اصل وجہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے فطری دستور سے رُوگردانی ہے۔ اسی لیے مُسلمان دُنیا میں دن بدن ذلّت وخواری کی گہری کھائی میں اُترتا چلا جا رہا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رُکے گا۔ البتہ دُنیا کے بعض خطوں میں کچھ عرصہ سے بیداری کی لہر پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے وہاں کے لوگ غیر فطری قوانین سے بیزار ہو کر امن و سلامتی کے متلاشی اپنے پروردگار کے حضور گناہوں پر شرمندہ اسلامی قوانین کی برکات کے حصول کے لیے کمر بستہ نظر آ رہے ہیں۔ گزشتہ چند ماہ سے پاکستان کے شمالی علاقہ مالاکنڈ ایجنسی میں شرعی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ بہت زور و شور سے کیا جا رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے اُنکے مطالبات تسلیم کرنے کا وعدہ کیا گیا مگر ملکی قائدین کے سابقہ مذاق کے پیشِ نظر لوگوں کو ان وعدوں پر اعتماد نہ آیا اور یوں تحریک ایک بار پھر زور دار طریقہ پر اُبھری اس بار چند پُر تشدّد واقعات بھی

پیش آئے۔ حکومت نے اس بہانے فوجی اور نیم فوجی دستے نفاذِ شریعت کا مطالبہ کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے جھونک دیے۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ حالات پر قابو پا لیا گیا ہے، مگر دیگر ذرائع سے موصول ہونے والی خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں حالات پر مکمل کنٹرول کرنا بظاہر حکومت کے لیے مشکل ہوگا۔ جبکہ وہاں کا ہر شخص مسلح اور پیدائشی طور پر جنگجو ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حکومت سچے دل سے اُن کے مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے فوری طور پر شریعت کا نفاذ کرتی تاکہ کسی قسم کی کوئی غلط فہمی پیدا ہی نہ ہوتی۔ حکومت کا اس انداز میں فوجی ایکشن لینا جیسے کہ کافروں کے خلاف لیا جاتا ہے ہرگز مناسب نہ تھا۔ ہماری دعا ہے کہ فوج و عوام ہر دو میں اللہ تعالیٰ نفاذِ شریعت کا سچا جذبہ پیدا فرمائے۔ آمین۔

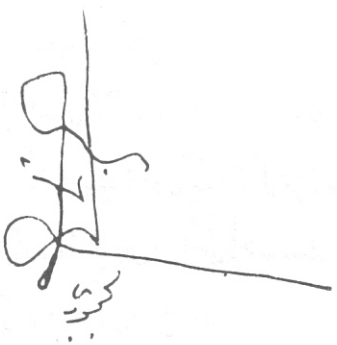

قسط: ۲۰

# درسِ قرآن حکیم

از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
تبویب و تزئین: مولانا نعیم الدین صاحب فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝

(ترجمہ) اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو۔ تو کہہ خبر تو ہے اللہ کے پاس اور میرا کام تو یہی ڈر سنا دینا ہے کھول کر پھر جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آ لگا تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کر دے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو عذاب دردناک سے تو کہہ وہی رحمٰن ہے ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا سو اب تم جان لوگے کون پڑا ہے صریح بہکائے میں۔ تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمہارا خشک پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی نتھرا۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو قیامت سے ڈرایا کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ

پوری دُنیا ختم ہو جائے گی اور اُس کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہو گی تو اُس زندگی کے لیے اس زندگی میں کچھ کرو، اگر کچھ کر لیا سامان تو اگلی زندگی راحت سے کٹے گی اور اگر نہ کیا یا بُرا سامان مہیّا کیا تو اگلی زندگی تکلیفوں میں کٹے گی اور چونکہ وہ اگلی زندگی دَوامی اور اَبدی ہے۔ اس لیے راحت کا سامان کیا تو راحت بھی دوامی ہو گی اور مصیبتوں کے سامان کر لیے تو وہ مصیبتیں بھی دوامی اور ابدی ہوں گی جو کاٹے نہیں کٹیں گی اس لیے آپ نے قیامت کو پیش فرمایا، تو اُس پر قوم نے جُھٹلایا حضور کو جس کی شکایت فرمائی حق تعالیٰ نے کہ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یہ جو آپ قیامت سے ڈراتے ہیں وعدہ دیتے ہیں وہ کب کو آئے گی، وہ آگیوں نہیں جاتی قیامت؟ تو اگر ہو تو اُسے لے آیئے جلدی سے برسوں برس سے صدیوں سے ہزاروں برس سے وعدے دے رکھے ہیں آپ نے کہ دُنیا ختم ہو گی تب وہ آئے گی تو اُسے اگر آنا ہے تو وہ جلدی کیوں نہیں آجاتی تاکہ آپ کو بھی ہمیں جھٹلانے کا موقع نہ رہے۔ قیامت سامنے آجائے تو مجبور ہو کر ہم یقین کر لیں۔ یہ سوال کیا کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ کب آئے گی وہ قیامت؟

**قیامت کے سوال کا منشاء دو چیزیں ہو سکتی ہیں**

اس سوال کا منشاء دو ہو سکتے ہیں اور تھے بھی دو، ایک تو یہ کہ بعضے قیامت ہی کے منکر تھے کہ کوئی زندگی اگلی آنے والی نہیں ہے ان کے مزاجوں میں دہریّت تھی نہ وہ اس عالم کی ابتدا کے مُقِرّ تھے نہ انتہاء کے مُقِرّ تھے کہ بس یُونہی چلا آرہا ہے قصّہ، یُونہی چلتا چلا جائے گا ابدالآباد تک، اِنْ هِيَ اِلَّا حَيٰوتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيٰى وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ یہ زندگی ہماری، مر رہے ہیں۔ جی رہے ہیں یُونہی دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ یونہی دیکھتے ہوئے چلے جائیں گے تو زمانہ ہمیں زندگیاں دے رہا ہے زمانہ ہی آتا ہے وقت گزرتا ہے موت آجاتی ہے، یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ نہ قیامت ہے نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، تو کچھ تو دہریہ مزاج تھے کہ جو شروع ہی سے منکر تھے قیامت کے،

**فلاسفۂ یُونان بھی دہریوں کی طرح قیامت کے منکر ہیں**

جیسا کہ فلاسفۂ یُونان وہ بھی منکر ہیں قیامت کے، وہ عالم کو قدیم مانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہے دُنیا اور ہمیشہ اسی طرح چلی جائے گی نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، نہ کوئی انتہا ہے اس عالم کی۔

**فلاسفۂ ہند بھی قیامت کے منکر ہیں**

فلاسفۂ ہند، یہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ابتداء بھی نہیں ہے اور انتہاء بھی نہیں ہے اور اگر ہے بھی انتہاء تو وہ انتہائیں بھی ہزاروں آئیں گی، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اتنے ارب اتنے کھرب اتنے کروڑ اتنے لاکھ برس تک یہ قائم رہتی ہے دُنیا اور پھر پرلو آجاتی ہے قیامت آجاتی ہے۔ عالم مٹ جاتا ہے اور پل بھر میں پھر از سرِ نو بننا شروع ہوجاتا ہے۔ اور چار بیسی یعنی جو سب سے اوّل پیدا ہوتے ہیں تبت کے پہاڑ وہ میں اُن پر ریت اُترتا ہے پھر دُنیا چلتی ہے اور چار ارب اور چار کھرب اور چار کروڑ برس تک پھر چلتی رہے گی پھر پرلو آئے گی اور پھر از سرِ نو، تو ارواح اُن کے یہاں گننی کی متعیّن ہیں وہی لوٹ پھیر کر آتے جاتی ہیں وہ مختلف جُون بدلتی رہتی ہیں تو ابتداء و انتہاء کے یہ بھی قائل نہیں اور فلاسفۂ یونان بھی قائل نہیں یعنی جتنے بھی بندگانِ عقل ہیں وہ قائل نہیں ہیں قیامت کے اُن کا خُدا اُن کی عقل ہے ان کے نظریات اُن کے عقائد ہیں اس واسطے اُن کے عقائد میں یہ چیز آئی نہیں کہ ابتداء ہے اس عالم کی، تو وہ درحقیقت خُدا کے وجود کے بھی منکر ہیں اور کائنات کی انتہاء کے بھی منکر ہیں تو ایک نمونہ عرب میں موجود تھا جو منکر تھے قیامت کے تو ایک منشاء تو اُن کے سوال کا استہزاء اور مسخرہ پن ہے کہ جو چیز آنے والی نہیں ہے آپ خواہ مخواہ اس سے ڈرا رہے ہیں ہمیں نہ قیامت آوے نہ عالم ختم، بعض قائل تھے قیامت کے مگر اس کے مقصد سے واقف نہیں تھے کہ حقیقت کیا ہے قیامت کی، اس کی جہالت کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا تمسخر آمیز کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ کب کو آئے گی وہ قیامت تو قیامت کی حقیقت پیشِ نظر نہیں یعنی یہ پیشِ نظر نہیں تھا کہ ایک زندگی ختم ہوکر اس کے ثمرات اگلی زندگی میں نکلیں اور اُس کے لیے لازمی ہے کہ ایک عالم ختم کیا جائے اور دوسرے عالم کی بُنیاد ڈالی جائے تاکہ مجموعۂ بنی آدم کو نتائج دیکھنے کا موقعہ ملے اچھے اور بُرے، یہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایک جہان بدل کر کے دوسرے جہان نہ لایا جائے تو بعضے اس حقیقت کے منکر تھے تو قیامت کے قائل تھے مگر حقیقت سے لاعلم تھے اس واسطے یہ سوال کیا کہ کب کو آئے گی وہ قیامت ؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا انکار ہو یا قیامت کے مقصد کا انکار ہو یہ اپنی بھی تکذیب ہے اور مشاہدات کی بھی تکذیب ہے خود اپنے دیکھے کو جھٹلانا ہے۔

**قیامتیں تین ہیں، شخصی[1]، قرنی[2]، کلی[3]**

اس واسطے کہ قیامت ایک ہی نہیں ہے بلکہ کئی ہیں

قیامتیں، ایک قیامت ہے شخصی اور ایک قیامت ہے قرنی اور ایک قیامت ہے کلّی۔ شخصی قیامت ہر شخص کی موت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ جو مرگیا اس کی قیامت قائم ہوگئی تو یہ شخصی قیامت ہے کہ ہر شخص کے اُوپر آرہی ہے یعنی ایک زندگی ختم ہوتی ہے اگلی زندگی شروع ہوجاتی ہے تو یہ شخصی زندگی ہے، شخصی موت ہے اور شخصی قیامت بھی، دوسری قیامت ہے قرنی، یعنی ایک نسل کا اختتام جس کا اندازہ تخمینہ سو برس ہے سو برس کے اندر اندر ایک نسل ختم ہوجاتی ہے اور دوسری نسل کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی فرد کی عمر اتفاق سے بہت بڑھ جائے سو دو سو برس ہوجائے تو ایک فرد کا نام زمانہ نہیں ہوتا زمانہ کہتے ہیں اکثریت کو کہ ایک نسل کی نسل آجائے اور نسل کی نسل ختم ہوجائے ایک آدھ فرد رہ جائے تو اس سے نسل پہ کوئی اثر نہیں پڑتا تو ایک صدی گویا رکھی گئی ہے ایک نسل کے لیے تخمینی طور پہ اسی واسطے حدیث میں تجدید کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے کہ دین کو تازہ بہ تازہ کیا جائے گا تو ہر صدی کے اُوپر مجدّد کا وعدہ کیا گیا ہے اس اُمت میں تو نبی نہیں آئے گا، اس اُمّت میں یہ نبوّت آخری ہے لیکن مجدّدین آئیں گے ہر سو برس کے بعد اللہ تعالیٰ مجدّد پیدا کریگا کہ لوگ اپنی خود رایوں سے دین میں جو خلط ملط کریں گے کچھ بدعات ملادیں گے، کچھ منکرات، مجدّد آکر پھر دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی الگ کردے گا اور پھر از سرِ نو دین تازہ بہ تازہ ہوجائے گا اس لیے وعدہ دیا گیا ہے کہ ایک طبقہ ہمیشہ اس اُمّت میں حق پر رہے گا کبھی حق منقطع نہیں ہوگا اس سے وہی ایک بیج کی مانند ہوگا اس میں سے کونپلیں پھوٹیں گی اور نئی شاخیں پھر اُبھر آئیں گی اور مجدّدین آکر دین کی تجدید کریں گے اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا کہ اللہ تعالیٰ تازہ بہ تازہ کرے گا اس دین کو ہر صدی پر، ہر صدی پہ مجدّد آئیں گے۔

**ہر صدی کے شروع میں مجدّد آنے کی حکمت**

تو ہر سو برس کے بعد مجدّد کا وعدہ اس لیے کیا گیا ہے کہ سو ہی برس ہوتے ہیں ایک نسل کے جب نئی نسل آتی ہے تو کچھ نظریات بھی نئے ہوتے ہیں کچھ حالات نئے ہوتے ہیں، زمانے میں کچھ ترقی ہوتی ہے، ان ترقیات سے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے دین کے (بارے میں) مجدّد آکر اس قرن کی ضروریات کو سامنے رکھ کر دین کی جب تجدید کرتا ہے تو پھر دین قلوب میں تازہ بہ تازہ ہوجاتا ہے کیونکہ ایک نسل کے آغاز اور ایک نسل کے اختتام کا عمومی طور پر اندازہ سو

برس ہے اسی لیے سو برس پر مجدّد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا حاصل نکلا کہ ہر سو برس بعد ایک قیامت قائم ہوتی ہے یعنی ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کے لیے جگہ چھوڑتی ہے اُسے قیامتِ قرنی کہتے ہیں اور ایک تیسری قیامت ہے جو قیامتِ کلّی ہے کہ پُورے عالم پر موت طاری ہو جائے آسمان سے لیکر زمین، پہاڑ دریا حتّٰی کہ ملائکہ علیہم السّلام ارواحِ مقدسہ کوئی چیز باقی نہ رہے اور اَحَدِیَّتِ مطلقہ کا ظہور ہو صرف ایک اللہ کی ذات قائم رہے تو جیسے اُس کا نام واحد ہے کہ وہ ایک ہے ایسے ہی اس کا نام اَحَدْ بھی ہے کہ وہ یکتا ہے اور بے مثل اور بے مثال، تو یکتائی کا ظہور نہیں ہو سکتا جب تک ہر چیز مٹ کر تنہا ذاتِ واحد نہ رہ جائے۔

**عالمِ دُنیا اللہ تعالیٰ کی صفات کے ظہور کیلئے بنایا گیا ہے**

یہ عالم اللہ نے بنایا ہے اپنی صفات کے اظہار کے لیے تو تمام صفات ظاہر ہوں گی رحمانیّت بھی ظاہر ہو رہی ہے غفوریّت بھی ظاہر ہے رزّاقیّت بھی ظاہر ہے۔

**اللہ تعالیٰ کی صفتِ احدیت کے ظہور کیلئے قیامت کا آنا ضروری ہے**

احدیت کا ایسا ظہور کہ کوئی نہ ہو اور وہ ہو یہ جب ہی ہوگا کہ جب پُورے عالم کا نظام ختم کر دیا جائے اور اُسکے بعد پھر ایک نیا نظام لایا جائے تو احد کی صفت کے ظہور کے لیے قیامت قائم کی گئی ہے تو ایک قیامت شخصی ہُوئی ایک قرنی ہُوئی ایک قیامت کلّی ہُوئی، دو قیامتیں وہ ہیں جو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اُنھیں، ہر انسان جب مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہوتی یہ ہر ایک کی نگاہوں کے سامنے ہے تو جس عالم کے اجزاء پر قیامتیں آ رہی ہیں کیسے ممکن ہے کہ اس کے کل پر قیامت نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فنا کے قبول کرنے کی صلاحیّت ہے جبھی تو ہر ہر جزء اس کا موت کی طرف جاتا ہے اگر اس عالم میں صلاحیت نہ ہوتی موت کے قبول کرنے کی تو ایک فرد بھی اسکا نہ مرتا، ایک جزء میں بھی تغیّر نہ ہوتا۔ سارے اجزاء علیٰ حالہٖ باقی رہتے لیکن جب ایک ایک جزء موت کی طرف جاتا ہے تو مجموعہ بھی یقیناً موت کی طرف جائے گا۔ ان اجزاء کے مجموعہ ہی کا نام تو عالم ہے اب انفرادی طور پر یہ اجزاء جتنے ہیں ایک وقت آئے گا کہ مجموعہ مل کر مٹ جائے گا پُورے عالم پر موت طاری ہو جائے گی تو جس کے ایک جزء میں یہ خاصیت ہے وہ کل کے اندر بھی ہوگی ورنہ اجزاء میں وہ بات نہ پیدا ہوتی اجزاء میں خاصیت نہ آتی، تو موتِ شخصی قیامتِ شخصی ہم روز دیکھتے ہیں ہر فرد پر۔

مولای صلّ وسلّم دائماً ابداً علی حبیبک خیر الخلق کلّھم

# درسِ حدیث

استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ کے زیرِ اہتمام ہر انوار کو نمازِ مغرب کے بعد جامعہ مدنیہ میں "مجلسِ ذکر" منعقد ہوتی تھی۔ ذکر سے فارغ ہو کر حضرت رحمہ اللہ حدیث شریف کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ ذکر و بیان کی یہ مُبارک اور رُوح پرور محفل کس قدر جاذب و پُرکشش ہوتی تھی الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔

محترم الحاج محمود احمد عارف رح کی خواہش و فرمائش پر عزیز بھائی شاہد صاحب سلمہٗ نے حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کے بہت سے دروس ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر لیے تھے اور پھر دروس والی تمام کیسٹیں اُنھوں نے مولانا سیّد محمود میاں صاحب کو عطا کر دیں۔

ہماری دُعا ہے کہ جن کی مہربانی، توجّہ اور سعی سے یہ انمول علمی جواہر ریزے ہمارے ہاتھ لگے، حق تعالیٰ اُن سب کو بیش از بیش اَجر سے نوازے۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ یہ قیمتی لوءلوء لالہٗ "انوارِ مدینہ" کے ذریعہ حضرت رحمہ اللہ کے مریدین و احباب تک قسط وار پہنچاتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ حضرت کے خلفِ اکبر اور جانشین حضرت مولانا سیّد رشید میاں صاحب کے زیرِ اہتمام ذکر و درس کا یہ سلسلہ بفضلہ تعالیٰ اَب بھی جاری ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشاں است		خم و خمخانہ با مہر و نشان است

کیسٹ نمبر ۵، ۱۹۸۱ء

اَلحمد للہ رب العٰلمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ خیر خلقہ سیّدنا ومولانا محمد وّآلہ واصحابہ اجمعین

امّا بعد! عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ ھٰذِہِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ کَمَا یَصْدَأُ الْحَدِیْدُ اِذَا اَصَابَہُ الْمَاءُ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَاجِلَاءُ ھَا قَالَ کَثْرَۃُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَۃُ الْقُرْاٰنِ [1]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: یاد رکھو یہ دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسا کہ پانی پہنچنے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے، عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ان کی صفائی کا کیا ذریعہ ہے؟ آپ نے فرمایا موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآنِ کریم کی تلاوت۔

---

[1] مشکوٰۃ، ص: ۱۸۹۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دِلوں پر زنگ آجاتا ہے جیسے لوہے پر زنگ آجاتا ہے اگر اُسے پانی لگ جائے تو عرض کیا گیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وَمَا جِلَآؤُھَا یہ ٹھیک کیسے ہوگا، لوہے کو زنگ لگ جائے تو اُسے صاف کرنے کا طریقہ اور ہے اور دِل اگر زنگ آلود ہوجائے تو وہ کیسے صاف ہوگا۔ وہ کیسے ٹھیک ہوگا؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کَثْرَۃُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَۃُ الْقُرْآنِ یہ دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ موت کا ذکر، موت کی یاد زیادہ کی جائے اور دوسرے ہے قرآنِ پاک کی تلاوت اس سے یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ دِل کے اندر جو خرابیاں آتی ہیں وہ دُھل جاتی ہیں۔ دل میں چیزوں کی محبّت اور دُنیا کی محبّت جڑ پکڑ جاتی ہے وہ جڑ کیسے کٹے اُس کی، تو وہ اسی طرح کٹ سکتی ہے کہ انسان موت کو یاد رکھے کہ یہ سب چیزیں چھوٹ جانے والی ہیں اور کوئی بھی چیز ساتھ جانے والی نہیں۔ ورنہ اگر ایسا وہ نہیں کرے گا

**انسان جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے اتنی ہی دُنیا کی محبّت بڑھتی جاتی ہے**

تو پھر یہ ہے کہ جتنا بڑا ہوتا جائے گا اُتنی اُسے دُنیا کی محبّت اور بڑھتی جائے گی اور یہ بھی نہیں ہے کہ کسی چیز سے اُس کی محبّت کم ہوجائے اگر ایک کوٹھی تھی دو بنالے گا۔ دو تھیں چار بنالے گا اور پہلے ایک کوٹھی سے محبّت تھی تو اَب چار سے ہوگئی۔ ایک باغ تھا دو بنالیے چار بنالیے چھ بنالیے اَب چھ باغوں سے محبّت ہوگئی اُسے، گویا یہ دُنیا کی محبّت جو ہے یہ دل کو گھیرے چلی جاتی ہے اور اس میں مضبوطی بڑی ہے کہ انسان اس سے چھٹکارا نہیں حاصل کرسکتا اور اگر وہ کہتا ہے کہ نہیں جی، مجھے نہیں ہوگی یا مجھے نہیں ہے تو یہ کہنا عام آدمی کا تو غلط ہے۔ عام آدمی کی حالت تو ایسی نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ اللہ نے کسی کے دل میں ایمان بنادیا اس کی حالت ایسی ہو تو ہو، ورنہ نہیں۔ جب بڑا ہوجاتا ہے آدمی، بُوڑھا ہوجاتا ہے۔ بچّے بھی کمانے لگتے ہیں (معاشی طور پر) ٹھیک ٹھاک ہوجاتا ہے تو اُسے چاہیے تھا کہ اللہ اللہ کرے، وقت الگ ہوکے بیٹھ کر گزارے، خدا کی یاد میں گزارے ایسا نہیں ہوتا بلکہ بیٹوں کی، پوتوں کی، پڑپوتوں کی، بیٹیوں کی نواسوں کی، نواسیوں کی اور کس کس کی اُس کو محبّت بڑھتی چلی جاتی ہے اور عورتیں جو ہوتی ہیں وہ تو بڑے جھگڑے کرتی ہیں ان باتوں پر، گھر کے اندر کوئی عورت ہوگی اس کی وہ بہو ہوگی۔ بچّے سے اس کے محبّت ہوگی۔ کیونکہ وہ پوتے ہیں اور بہو سے نفرت ہوگی روز لڑائی جھگڑے لڑائی جھگڑے سارا وقت اسی میں گزر جاتا ہے اور وہ اگر الگ بیٹھنا چاہے اور چاہے کہ اللہ اللہ کرلوں تو وہ

نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ گھر میں رہتی ہے اس کا دائرہ اور بھی محدود ہے اس واسطے اس کے سامنے تمام چیزیں ہوتی ہیں اور تمام چیزوں پر نوک جھونک وہ کرتی ہیں اور مرد ہوتا ہے تو وہ ذرا اس سے کم ہے وہ اِدھر اُدھر بھی کچھ ہو جاتا ہے۔ بٹ جاتا ہے اس کا حصہ، تو اس طرح سے دُنیا جو ہے اس کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ دُنیا آئے اور اُس کی محبّت نکل جائے یہ غلط بات ہے، نہیں۔

**دُنیا جب آتی ہے تو غیر محسوس طور پر اپنی محبّت بھی لاتی ہے**

دُنیا جب آئے گی تو ساتھ ساتھ اپنی محبّت اور چاہت بھی لائے گی، جیسے کسی کی کوئی چیز ہو تو اُسے آدمی دیکھتا ہے تو اُس کی اتنی احتیاط نہیں کرتا، لیکن اپنے آپ جو خرید کر لے آتا ہے گھر میں اور چیز اپنی ہوتی ہے اور شیشے کی ہوتی ہے نازک ہوتی تو کہتا ہے کہ کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے حالانکہ وہ دُکان پر جب رکھی ہوتی تھی تو وہ ٹوٹ بھی جاتی تو بھی اتنا خیال نہ ہوتا۔ اپنی ہونے کے بعد جو اس کا تعلّق بڑھا ہے قلبی، پس اسی غیر محسوس طرح انسان محسوس بھی نہیں کرتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ ہوتا یہ ہے جو جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا اور دلوں پر زنگ آتا چلا جاتا ہے۔ زنگ اس قسم کا مراد لگتا ہے جو دُنیا ہی کی چیزوں کی محبّت سے ہوتا ہے۔

**دُنیا کی محبّت بڑھنے سے خُدا کی یاد کم ہو جاتی ہے**

جب دُنیا کی محبّت بڑھے گی، خُدا کی یاد کم ہو گی۔ خُدا کی یاد کم ہونا یہی دل کا زنگ ہے، (اس بارے میں) عرض کیا گیا، تو آقائے نامدار صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اسکا علاج یہ ہے کہ موت کو کثرت سے یاد کرو، پہلے تو ایسے ہی ہو گا خیال آیا نکل گیا، آیا نکل گیا خیال، لیکن بعد میں پھر ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ یہ سب چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں ان سے دل کا تعلّق کم کرنا چاہیے اور پھر ٹھیک ہو جاتا ہے جب اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے آدمی اور اللہ سے مدد چاہے کہ اللہ تعالیٰ تو میری اصلاح فرما دے تو مجھے ٹھیک کر دے تو انسان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ رفتہ رفتہ تعلّق کم ہوتا چلا جاتا ہے (دُنیا سے)، پھر کسی چیز سے بھی تعلّق اُتنا نہیں رہتا جتنا خُدا کی ذات سے ہو جاتا ہے۔ باقی سب چیزیں دوسرے درجے میں چلی جاتی ہیں تو اس طرح کا (اگر معاملہ ہو تو) چاہے وہ سب چیزیں قائم رہیں اُس کی، کتنا بھی بڑا مالدار ہو، کتنا بھی بڑا وہ زمیندار ہو، کارخانے دار ہو، لیکن اگر اُس نے اپنی اصلاح کرنی چاہی ہے اور اصلاح کی دُعا مانگتا ہے۔ خدا سے تو پھر اُس کا یہی ہو جائے گا کہ اُس کو ان چیزوں کی محبّت نہیں رہے گی۔

**دل میں غیرِ خدا کی محبّت نہ رہنا خُدا کا احسان ہے**

اور محبّت نہ رہے کسی چیز کی، تو یہ بڑا احسان ہے خُدا کا۔ ورنہ بڑی تکلیف میں مُبتلا رہتا ہے انسان، جب کسی چیز کی محبّت ہو تو بس اس میں تکلیف میں مُبتلا رہتا ہے اور نکل جائے اور خُدا ہی کی رہ جائے محبّت، پھر بالکل ٹھیک ہے پھر کوئی بات نہیں رہتی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آدمی یہ نہیں ہے کہ بال بچّوں کو چھوڑ دے اور ایک طرف بیٹھ جائے اور سمجھے کہ میری محبّت نہیں رہی تو مَیں بہتر ہوں یہ بھی نہیں بتایا، شریعت نے ہر ایک کی درجہ بندی کی ہے اور اس میں انسان کو مکلّف کیا ہے کہ تیرے ذمّے ہے یہ کام کرنا اَب دِل چاہے یا نہ چاہے کرے گا وہ کام، تو دونوں چیزوں کو کو شریعت نے جمع کیا، دُنیا کو بھی اور آخرت کو بھی اور اُس کے طریقے بتلائے اور یہ بتایا کہ اسطرح کرو۔ اس طرح کرو گے تو اس میں کامیابی حاصل ہوجائے گی۔ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک تو یہ بات فرمائی کَثِّرُوْا ذِکْرَ الْھَوْتِ کہ انسان ویسے ہی موت کا ذکر کرتا رہے اور رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ دل میں بیٹھ بھی جائے گی یہ بات کہ آخر ایک دن خُدا کے ہاں جانا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تلاوت قرآن کریم کرے۔

**تلاوتِ قرآن جس طرح بھی ہو مفید ہے**

تلاوت قرآنِ کریم لفظوں میں ہو تو بھی فائدہ ہے آدمی کسی رنج میں مُبتلا ہو تو پھر تلاوت سے اس کے دِل کو بڑی تشفی ہوتی ہے یہ قدرتی بات اللہ نے رکھی ہے اس میں سکینہ وسکون ہے قرآن پاک کی تلاوت میں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر اسکی ہمّت ہو اور وہ ترجمہ بھی سمجھ لے۔ اسکی تفسیر سمجھے کچھ وقت اس پر لگائے آدھا، پونا گھنٹہ لگا دیا کرے روزانہ چند آیتوں کو دیکھ لیا کرے، تلاوت الگ کرے تلاوت تو دس منٹ میں ہو جاتی ہے۔ پندرہ بیس منٹ کسی آیت کی تفسیر دیکھ لی کبھی کچھ دیکھ لیا کبھی کچھ دیکھ لیا، اگر ایسے کرنے لگے تو قلب و ذہن پر اس کے اور بھی اچھّا روحانی اثر پڑے گا۔ سرورِ کائنات علیہ الصلاۃ والسّلام نے ہمیں بیماریاں بھی بتائی ہیں اور علاج بھی بتائے ہیں، اور یہ بیماریاں وہ ہیں جو انسان کی اپنی ذاتی ہوتی ہیں اخلاقی ہوتی ہیں اور اُن کا علاج آدمی کبھی تو خود کرتا ہے مگر کامیاب نہیں ہوتا، تو طریقے اس کے بتلائے ہیں علاج بتایا ہے جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے۔

قسط: ۲۷

# دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو دعوت اور طریقۂ دعوت

حضرۃ شیخ الحدیث مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ کی تصنیف لطیف "سیرۃ مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے چند اوراق

**اہلِ کتاب**

قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ ۔ تا ۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ آل عمران ۔ رکوع ۷)

ترجمہ: اے نبی۔ تم اہلِ کتاب سے (یہود اور نصاریٰ) سے کہہ دو۔ اے اہلِ کتاب (اختلاف ونزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو) اُس بات (اُصول) کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لیے یکساں طور پر تسلیم شُدہ ہے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنالیا ہے۔

(سورۃ ۳/ آل عمران آیت ۶۴)

**وجہ اختلاف**

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا ۔ تا بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (سورۃ ۲۲/ الحج رکوع ۹)

(اے نبی) ہم نے ہر اُمّت کے لیے عبادت کا ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چل رہی ہے۔ بس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنی اسلام کے طور طریق میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ اگر (اس پر بھی) لوگ تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے کہ اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ تم جن باتوں میں آپس میں اختلاف کر رہے ہو قیامت کے دن وہ تمہارے درمیان فیصلہ کر کے حقیقت حال آشکارا کر دے گا۔ (سورۃ ۲۲/ الحج آیت ۶۶ تا ۶۸)

تشریح : ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا اسلوب اور طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ:

(الف) ان باتوں کو مقدم رکھا جائے جن کو مخاطب بھی مانتے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ ہونی چاہیے۔ غیر اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہیے کہ معلوم ہو کہ خدا کو چھوڑ کر اُن کو معبود مان لیا ہے۔ اس کو اہلِ کتاب بھی مانتے ہیں۔ لہٰذا پہلے اسی پر زور دیا جائے۔

(ب) یہ سمجھایا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کا دین بھی ایک ہی ہے۔ اس کی بُنیادی باتیں بھی ایک ہی ہیں۔ عبادت کا حکم ہمیشہ رہا۔ اختلاف اس کے طور طریق میں ہُوا، کیونکہ ہر ایک عہد اور ہر ایک دور اور ہر ایک قوم کی حالت یکساں نہیں تھی۔ جس کی جیسی حالت اور جیسی صلاحیّت اور قابلیّت تھی اس کے مطابق اس کو طور طریق دیا گیا جو ہر دَور میں ترقی کرتا اور آگے بڑھتا رہا۔ بس یہ اختلاف فطری اور قدرتی تھا جو واقع ہُوا۔[1]

(ج) دعوت دینے والے کے دل میں دوسرے مذہب کے طریقوں کا یہ احترام ہو کہ وہ سمجھے کہ بُنیادی طور پر وہ من جانب اللہ تھے تو اس سے اس کے اندازِ دعوت میں لامحالہ لچک ہوگی، دوسری طرف جن کو دعوت دی جا رہی ہے اُن کو بھی اس دعوت سے وحشت نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ دعوت پہلی بنیادوں کو اکھاڑ نہیں رہی بلکہ اُن کو اپنی جگہ تسلیم کرتے ہُوئے تعمیر میں اضافہ کر رہی ہے۔

(د) ان حقیقتوں کو ذہن نشین کرانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مخاطب یہ اثر لیں گے کہ جب سابق اُمّتوں میں اُن کی صلاحیتوں کے بموجب عبادت کے قواعد و قوانین میں فرق ہوتا رہا ہے تو ترقی یافتہ حالات کے مطابق اگر کوئی طریقہ معین کیا گیا جو مکمّل اور آخری طریقہ ہے تو وہ بھی قابلِ تسلیم ہونا چاہیے۔ اس سے وحشت نہ کرنی چاہیے۔

(ہ) پس تقاضا انصاف یہ ہے کہ سابق اُمّتوں کے لوگ (اہل کتاب) اس دعوت کو اختلاف اور نزاع کا نشانہ نہ بنائیں بلکہ اس کو پرکھیں۔ حقیقت پسندی سے کام لیں اور صداقت کو تسلیم کریں۔

---

[1] اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے انسان اور انسانیت منزل بہ منزل۔ دیباچہ سیرت مُبارکہ۔

(و) لیکن اگر مخاطب لوگ تمام حقیقتوں کو پس پشت ڈال کر نزاع کرنا اور جھگڑنا ہی پسند کریں تو داعی الی اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بھی اُن کی طرح ضِد، عناد اور نزاع میں پڑے بلکہ وہ "اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ" کہہ کر الگ ہو جائے اور اُن کا معاملہ خُدا کے حوالے کر دے کہ قیامت کے دن وہی ان نزاعات کا فیصلہ کرے گا۔ (واللہ اعلم)

**اہلِ شرک** اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ ۔تا۔ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔

(سورۃ ۶ الانعام رکوع ۱۳)

(ترجمہ) (اے نبی) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے۔ تم اس کی پیروی کرو۔ کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اسی کی ذات اور کنارہ کرو مشرکین سے اور اگر اللہ چاہتا تو (وہ اس کی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو اس طرح بنا دیتا کہ سب ایک ہی راہ پر چلنے والے ہوتے اور) یہ لوگ شرک نہ کرتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ مشیتِ خداوندی کا یہی فیصلہ ہُوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے۔ پس تمہارا کام یہی ہے کہ سچائی کی راہ دکھا دو (اُنہیں جبراً اپنی راہ پر چلانا تمہارا کام نہیں ہے) ہم نے تمہیں نہ تو اُن پر پاسبان بنایا ہے (کہ اُن کی رائے اور عمل کی نگرانی کرو) اور نہ تمہارے حوالہ ان کی ذمہ داری ہے (کہ ان کے نہ ماننے کا کوئی الزام تم پر آئے۔)

اور (مسلمانو) جو لوگ خُدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پُکارتے ہیں تم اُن کے معبودوں کے متعلق بدکلامی نہ کرو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر بے سوچے سمجھے خُدا کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر قوم کے لیے اس کے کاموں کو خوش نما بنا دیا (کہ ہر قوم اپنی راہ رکھتی ہے اور اپنی ہی راہ اُسے اچھی دکھائی دیتی ہے) پھر آخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ اس وقت وہ ان سب پر اُن کے کاموں کی حقیقت کھول دے گا۔ جو وہ (دُنیا میں) کرتے رہے ہیں۔ (سورۃ ۶ الانعام آیت ۱۰۷ تا ۱۰۸)

تشریح: یعنی یہ تو حقیقت ہے کہ شرک ظلمِ عظیم[۲] ہے شرک کرنے والا خدا پر ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ خود

---

[۱] تمہارے عمل کو جو تم کر رہے ہو خُدا خُوب جانتا ہے۔ [۲] سورۃ ۳۱ لقمان آیت ۱۳۔

اپنے اُوپر بہت بڑا ظلم کرتا ہے کہ اپنی عظمت اور اپنی خودداری کو خود ہی پامال کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بلندی پر ہو پھر خود اپنے آپ کو پستی کے گڑھے میں گرادے۔ جہاں اس کو مردار خور پرندے تکّا بوٹی کر دیں یا ہواؤں کے جھونکوں کی لپیٹ میں آکر برباد ہو جائے[1] اس ظلم عظیم کا نتیجہ لامحالہ یہ ہے کہ مشرک کے لیے بخشش کی گنجائش نہیں[2] اور مشرک کا جنّت میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے اُونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا[3]، لیکن ان تمام قباحتوں اور نفرت انگیز خرابیوں کے باوجود داعی الی اللہ کے انداز میں نفرت اور تحقیر و تذلیل کی جھلک نہ ہونی چاہیے، وہ جب دعوت دے تو اس کی نظر اس پر ہونی چاہیے کہ اس کائنات میں رنگ برنگی، اس کے خالق اور پروردگار کی حکمت و قدرت کاملہ کا تقاضا ہے۔ اس چمن کی رونق ہی گلہائے رنگارنگ سے ہے اور اس کی زیبائش نہیں نکھرتی جب تک اس میں خاردار درخت اور پودے نہ ہوں، پھر ظاہر ہے کہ پھول پھول ہے۔ کانٹا کانٹا ہے۔ پھول کا جو مقام ہے وہ کانٹے کو میسّر نہیں ہو سکتا، مگر چمن کی کیاریوں میں جس طرح پھول کا پودا اپنی تازگی میں مست ہے۔ کانٹے کا جھاڑ بھی مگن ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سارا چمن اُسی کا ہے اور اسی کے لیے ہے۔ اس جھاڑ سے اگر پُوچھا جائے تو اُسے اس کا احساس نہیں کہ وہ کانٹا ہے اور دُنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہے اُسے اگر اس کا احساس ہوتا تو وہ چمن کی کیاری کے پاس بھی نہ جاتا بلکہ اُس کی نظر میں کچھ اپنی خوبیاں ہیں اس کو احساس ان خُوبیوں کا ہے۔ اسی لیے وہ چمن کی کیاری میں پھول کے پودے سے زیادہ سینہ زور ہے اور اپنی آن میں مست ہے۔ پس داعی الی اللہ کا فرض ہے کہ دعوت اور تبلیغ کے وقت وہ اس فلسفۂ قدرت کو سامنے رکھے۔ اگر وہ کانٹے کی اصلاح چاہتا ہے تو اُس کو خار ہونے کا طعن دے کر اصلاح نہیں کر سکتا۔ بلکہ اُس کی اصلاح جب ہو گی جب اس ذہنیت کی اصلاح ہو کہ وہ کانٹا ہے مگر اپنے آپ کو پھول کا ہمدوش سمجھتا ہے بلکہ خیابان پر پھول سے زیادہ اپنا حق جتاتا ہے۔

آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کو بھی حیوانات کی طرح بنا دیتا کہ

---

[1] سورۃ ۲۲ الحج آیت ۳۱ [2] سورۃ ۴ نساء آیت ۱۱۵ [3] سورۃ ۷ الاعراف آیت ۳۹۔

سب اپنی حالت میں ایک ہی طرح کے ہوتے لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا اس نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی پسند رکھتا ہے اور ہر گروہ کی نظر میں وہی کام اچھا ہے جو وہ کر رہا ہے۔ تمہاری نظر میں اس کی راہ کتنی ہی بُری ہو لیکن اس کی نظر میں وہ ایسی ہی اچھی ہے جیسی تمہاری راہ تمہاری نظر میں پس ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور رواداری سے کام لو جو لوگ شرک و بُت پرستی میں مبتلا ہیں تم اُنھیں دعوتِ حق دو۔ مگر بُرا بھلا نہ کہو۔ اگر تم اُن کے بُتوں کو بُرا بھلا کہو گے تو وہ بھی خدا کو بُرا بھلا کہیں گے نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم اُنھیں گالیاں دو گے وہ تمہیں دیں گے۔ طلبِ حق کی بات نہیں رہے گی۔ گالی گلوچ کی بات ہو جائے گی۔

**لامذہب، عقل پرست اور خُدا کے منکر (معاذ اللہ)**

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ تا۔ تَعْمَلُوْنَ (سورۃ یونس۔ رکوع ۳ آیت ۲۱، ۲۲)

ترجمہ: وہی ہے جس نے تمہارے لیے سطح زمین پر اور سمندر میں سیر و سیاحت کا سامان کر دیا ہے۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تم جہازوں میں سوار ہوتے ہو اور جہاز موافق ہوا پا کر تم کو لے اُڑتے ہیں۔ مسافر خوش ہوتے ہیں (کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے) پھر اچانک ہوائے تُند کے جھونکے آ پہنچتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں اُٹھ اُٹھ کر گھیر لیتی ہیں اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ بس اب ان میں گھر گئے (اور بچنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی) تو اس وقت اُنہیں (خدا یاد آتا ہے) وہ دین کے اخلاص کے ساتھ اُسے پکارنے لگتے ہیں۔ اے خدا اگر اس مصیبت سے نجات دے دے تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہوں گے۔ پھر (دیکھو) جب اللہ اُنہیں نجات دے دیتا ہے تو اچانک (اپنا عہد و پیمان بھول جاتے ہیں اور) ناحق ملک میں سرکشی اور فساد کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو تمہاری سرکشی کا وبال خود تمہاری جانوں پر پڑنے والا ہے۔ یہ دُنیا (چند روزہ) زندگی کے فائدے ہیں۔ اُٹھا لو پھر تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اس وقت ہم تمہیں بتائیں گے کہ جو کچھ دُنیا میں کرتے رہے اُس کی حقیقت کیا تھی (سورۃ یونس، آیت ۲۱، ۲۲)

تشریح: یہ ایک ایسی مثال ہے، اس طرح کی صُورتیں انسان کو زندگی کے اُتار چڑھاؤ میں اکثر پیش

آتی رہتی ہیں کہ تمام ذرائع اور وسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ فطرتِ انسان اس وقت بیدار ہوتی ہے۔ وہ لامحالا ایک بن دیکھی ہستی کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس کو وہ قادر، کارساز اور بگڑی کا بنانے والا سمجھتی ہے، وہی خدا ہے۔

قرآن شریف کا تقریباً ایک تہائی حصّہ اس طرح کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے جن میں خود انسان کے مشاہدات، تجربات اور خود اس کے وجدانی جذبات کو پیش کر کے خداوند عالم کے وجود اور اس کی صفاتِ قدسیہ کو ثابت کیا گیا ہے اور داعی الی اللہ کے لیے ناقابلِ تردید دلائل کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے مثلاً بحری سفر ہی کی ایک مثال دوسرے عنوان سے سورۂ بنی اسرائیل میں دی گئی ہے۔ ترجمہ یہ ہے

ترجمہ: (اے لوگو) تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کار برآریوں کے لیے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو (بحری راستوں سے فائدے اُٹھاؤ) بلا شُبہہ وہ تم پر بڑی ہی رحمت کرنے والا ہے اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم سمندر میں ہوتے ہو اور مصیبت آ لگتی ہے تو اس وقت وہ تمام ہستیاں تم سے کھو جاتی ہیں جنھیں تم پکارا کرتے ہو، صرف ایک اللہ ہی کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ پھر جب وہ تمہیں مصیبت سے نجات دے دیتا اور خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو اس سے گردن موڑ لیتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ پھر کیا تمہیں اس سے امن مل گیا ہے کہ وہ تمہیں خشکی کے کسی گوشے میں دھنسا دے یا تم پر پتھّر برسانے والی آندھیاں بھیج دے اور تم اس حالت میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ یا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تمہیں دوبارہ ویسی ہی مصیبت میں ڈال دے اور ہوا کا ایک سخت طوفان بھیج دے اور تمہاری ناشکری کی پاداش میں تمہیں غرق کر دے، پھر کسی کو نہ پاؤ جو اس کے لیے ہم پر دعوٰی کرنے والا ہو۔ اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اس کے تابع کر دیں کہ اسے اُٹھائے پھرتی ہیں اور اچھّی چیزیں اُس کی روزی کے لیے مہیّا کر دیں۔ نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے اُن میں سے اکثر پر اُسے برتری دے دی۔ پُوری برتری جیسی کہ ہونی چاہیئے۔

(آیت ۶۵ تا ۷۰ سورۃ ۱۷ بنی اسرائیل)

# فضیلت کی راتیں

مولانا نعیم الدّین صاحب، فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ

موجودہ دَور میں لوگ تقریباً ہر چیز ہی میں افراط و تفریط کا شکار ہیں خواہ اس چیز کا تعلّق دین سے ہو یا دُنیا سے عقائد سے ہو یا اعمال سے کچھ لوگ اس کو بڑھا کر اُس کے اصل مرتبۂ و مقام سے بھی آگے لے جاتے ہیں اور کچھ لوگ اُسے اس کا جائز مقام دینے کو بھی تیّار نہیں ہوتے، اِن ہی افراط و تفریط کا شکار چیزوں میں سے چند مخصوص راتیں ہیں، کچھ لوگ تو اُن راتوں کی فضیلت کا اس قدر زیادہ اعتقاد سمجھتے ہیں کہ سب کچھ اُن ہی کو سمجھ بیٹھے ہیں اور کچھ لوگ سِرے سے اُن کی فضیلت ہی کے مُنکر ہیں اور تحریراً و تقریراً اُن کے خلاف بَرسرِ پیکار ہیں۔ شریعتِ مقدسہ میں افراط و تفریط سے ہٹ کر درمیانی راہ بتلائی گئی ہے — اگر اس راہ پر چلا جائے تو منزل پر پہنچا جا سکتا اور مقصود کو پایا جا سکتا ہے۔

راقم الحروف سے بعض احباب نے اس بات کا تقاضا کیا کہ ایک رسالہ ترتیب دیا جائے جس میں ان راتوں کے متعلّق افراط و تفریط سے بچتے ہُوئے جو فضائل آئے ہیں اُن کا تذکرہ کیا جائے اور اُن کے متعلّق اسلاف کا جو عمل متوارث ہے اسے بیان کیا جائے، نیز جو لوگ اُن کے متعلّق افراط و تفریط کا شکار ہیں ان کی غلط فہمیاں دُور کی جائیں۔ خود راقم کا بھی عرصہ سے یہ خیال تھا احباب کے تقاضے سے اس کام کا مزید داعیہ پیدا ہُوا چنانچہ اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دیا گیا، اس میں ہمارا اسلوب یہ ہوگا کہ اوّلاً تو اُن راتوں کے متعلّق قرآن و حدیث میں جو فضائل آئے ہیں وہ ذکر کیے جائیں گے۔ ثانیاً ان راتوں میں اسلاف کا معمول ذکر کر کے جو منکرات اُن میں کیے جاتے ہیں اُن کی تردید کی جائے گی۔ ثالثاً منکرین کے شکوک و شُبہات کا جواب دیا جائے گا۔

وباللہ التوفیق۔

حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو اپنی جگہ ہر رات محترم اور فضیلت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث مبارکہ میں رات کے قیام اور اس میں دُعاء کرنے کی بڑی اہمیّت بتلائی گئی ہے چنانچہ حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"یُحْشَرُ النَّاسُ فِیْ صَعِیْدٍ وَّاحِدٍ یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ فَیُنَادِیْ مُنَادٍ فَیَقُوْلُ اَیْنَ الَّذِیْنَ کَانَتْ تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ فَیَقُوْمُوْنَ وَهُمْ قَلِیْلٌ فَیَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَیْرِ حِسَابٍ ثُمَّ یُؤْمَرُ سَائِرُ النَّاسِ اِلَی الْحِسَابِ" [1]

قیامت کے دن سب لوگ (زندہ کیے جانے کے بعد) ایک وسیع اور ہموار میدان میں اکٹھے کیے جائیں گے پھر اللہ کا منادی پکارے گا کہ کہاں ہیں وہ بندے جن کے پہلو راتوں کو بستروں سے الگ رہتے تھے (یعنی اپنے بستر چھوڑ کر جو راتوں کو تہجد پڑھتے تھے) پس وہ اس پکار پہ کھڑے ہو جائیں گے اور اُن کی تعداد زیادہ نہ ہوگی۔ پھر وہ اللہ کے حکم سے بغیر حساب کتاب کے جنّت میں چلے جائیں گے، اس کے بعد باقی تمام لوگوں کے لیے حکم ہوگا کہ وہ حساب کے لیے حاضر ہوں۔

حضرت عمرو بن عَبْسَہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا

"اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ الْآخِرِ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَکُوْنَ مِمَّنْ یَّذْکُرُ اللّٰهَ فِیْ تِلْکَ السَّاعَةِ فَکُنْ" [2]

اللہ تعالیٰ بندے سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری درمیانی حصّے میں ہوتے ہیں، پس اگر تم سے ہو سکے کہ تم ان بندوں میں سے ہو جاؤ جو اس مُبارک وقت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو تم اُن میں سے ہو جاؤ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔

---

[1] شعب الایمان للبیہقی ج:۳، ص: ۱۶۹ [2] ترمذی ج: ۲، ص: ۱۹۸

"یَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كُلَّ لَیْلَةٍ اِلَی السَّمَآءِ الدُّنْیَا حِیْنَ یَبْقٰی ثُلُثُ اللَّیْلِ الْآخِرُ یَقُوْلُ مَنْ یَّدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبَ لَهٗ مَنْ یَّسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَهٗ مَنْ یَّسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرَ لَهٗ" [1]

ہمارے مالک اور رب تبارک وتعالیٰ ہر رات کو جس وقت آخری تہائی رات باقی رہ جاتی ہے آسمانِ دُنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کون ہے جو مجھ سے دُعا کرے اور میں اُس کی دُعا قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے مانگے میں اُس کو عطا کروں کون ہے جو مجھ سے مغفرت اور بخشش چاہے میں اس کو بخش دوں۔

ان احادیثِ مبارکہ کی طرف نظر کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ہر رات ہی اہمیت کی حامل ہے یہی وجہ ہے کہ بارگاہِ خداوندی کے حاضر باش اور لذّتِ عبادت ومناجات سے آشنا شب زندہ دار لوگ بلا تفریق تمام راتوں کو اپنی عبادات سے معمور رکھتے ہیں اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ مقصود اصلی مالک کی رضا ہے اور وہ ہر رات اپنی رضا سے نوازنے کے لیے ندا کروا رہا ہے کسی نے خوب کہا ہے "مَنْ لَّمْ یَعْرِفْ قَدْرَ لَیْلَةٍ لَمْ یَعْرِفْ لَیْلَةَ الْقَدْرِ" جس نے "رات" کی قدر نہ جانی اسے "لَیْلَةَ الْقَدْرِ" کی کیا قدر معلوم ہوگی۔

حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

"بوستان میں حکایت ہے کہ کسی شہزادہ کا ایک "لعل" شب کے وقت کسی جگہ گر گیا تھا، اس نے حکم دیا کہ اس مقام کی تمام کنکریاں اُٹھا کر جمع کریں اُس کا سبب پوچھا تو کہا کہ اگر کنکریاں چھانٹ کر جمع کی جاتیں تو ممکن تھا کہ "لعل" ان میں نہ آتا اور جب ساری کنکریاں اُٹھائی گئی ہیں تو لعل ضرور آ گیا ہے، کسی نے اسی جملہ کا ترجمہ خوب کیا ہے

اے خواجہ چہ پرسی از شبِ قدر نشانی ہر شب شبِ قدرست گر قدر بدانی" [2]

تاہم اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ذوقِ عبادت اور لذّتِ مناجات سے ناآشنا اور کوتاہ ہمّت ہیں ایسے لوگوں کے لیے غنیمت ہے کہ وہ چند مخصوص راتوں ہی میں صحیح طور پر اللہ تعالیٰ

---

[1] بخاری ج: ۲، ص: ۳۶ و مسلم ج: ص: [2] فضائل صوم وصلوٰۃ ص: ۳۷۹

کی عبادت کر کے اسے راضی کرلیں، اسی جذبے کے تحت مخصوص راتوں کے فضائل قلمبند کیے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وہ چند مخصوص راتیں جن کی فضیلت قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہے درج ذیل ہیں۔

① شبِ جمعہ
② رجب کی پہلی رات
③ شبِ معراج
④ شبِ براءت
⑤ لیلۃ القدر
⑥ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی راتیں
⑦ ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں۔

## جمعہ کی رات اور رجب کی پہلی رات کی فضیلت

① حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے۔

"لَيْلَةُ الْجُمُعَةِ لَيْلَةٌ غَرَّاءُ وَيَوْمُ الْجُمُعَةِ يَوْمٌ أَزْهَرُ" [1]

جمعہ کی رات روشن رات ہے اور جمعہ کا دن چمکتا دن ہے۔

② حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا

"خَمْسُ لَيَالٍ لَا يُرَدُّ فِيهِنَّ الدُّعَاءُ لَيْلَةُ الْجُمُعَةِ وَأَوَّلُ لَيْلَةٍ مِنْ رَجَبٍ وَلَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ وَلَيْلَتَا الْعِيدِ" [2]

پانچ راتیں ایسی ہیں جن میں کی جانے والی دُعا رَد نہیں ہوتی۔ ۱۔ شبِ جمعہ۔ ۲۔ رجب کی پہلی رات۔ ۳۔ شعبان کی پندرہویں شب ۴۔ عید الفطر کی رات۔ ۵۔ عید الاضحیٰ کی رات۔

③ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

---

[1] شعب الایمان للامام البیہقی، ج: ۳ ص: ۳۷۵، فضائل الاوقات للامام البیہقی، ص: ۱۰۵ ومشکوٰۃ ص: ۱۲۱

[2] شعب الایمان ج: ۳ ص: ۳۴۲ وفضائل الاوقات ص: ۳۱۲، مصنف عبد الرزاق، ج: ۴، ص: ۳۱۷۔

"بَلَغَنَا اَنَّهٗ كَانَ يُقَالُ اِنَّ الدُّعَاءَ يُسْتَجَابُ فِيْ خَمْسِ لَيَالٍ فِيْ لَيْلَةِ الْجُمُعَةِ وَلَيْلَةِ الْاَضْحٰى وَلَيْلَةِ الْفِطْرِ وَاَوَّلِ لَيْلَةٍ مِّنْ رَّجَبٍ وَلَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ" [1]

ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ یوں کہا جاتا تھا کہ پانچ راتوں میں دُعا قبول ہوتی ہے۔ ۱۔ شبِ جمعہ۔ ۲۔ عیدالاضحیٰ کی رات۔ ۳۔ عیدالفطر کی رات۔ ۴۔ رجب کی پہلی رات اور شعبان کی پندرہویں شب۔

مذکورہ احادیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ شبِ جمعہ اور رجب کی پہلی رات اس لحاظ سے فضیلت کی حامل ہیں کہ اُن میں کی جانے والی دُعائیں قبول ہوتی ہیں لہٰذا جو لوگ شب زندہ دار ہوں اُنھیں چاہیے کہ وہ ان راتوں میں خلوص کے ساتھ دُعا میں مشغول ہوں۔ البتہ چونکہ صحیح احادیث میں ان راتوں کی کوئی مخصوص و متعین عبادت نہیں آئی اس لیے اپنی طرف سے کسی خاص عبادت کا ان راتوں میں معمول نہ بنائیں۔

**شبِ جمعہ کی ایک خاص فضیلت** جمعرات کی (اس فضیلت کے ساتھ ساتھ کہ یہ ایک روشن رات ہے اور اس میں دُعائیں قبول ہوتی ہیں) ایک دوسری فضیلت اور ہے وہ یہ کہ جو مُسلمان اس رات فوت ہوتا ہے وہ ایک تو منکر و نکیر کے سوال و جواب سے محفوظ رہتا ہے دوسرے وہ عذابِ قبر سے مامون ہو جاتا ہے اُسے عذابِ قبر نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اِلَّا وَقَاهُ اللّٰهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ" [2]

جو کوئی مُسلمان جمعہ کے دن یا جمعہ کی شب مرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے قبر کے فتنہ سے محفوظ فرما دیتے ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا

---

[1] شعب الایمان ج: ۳، ص: ۳۴۲، وسنن کبریٰ ج: ۳، ص: ۴۱۹ ولطائف المعارف للامام ابن رجب الحنبلی ص: ۱۴۴

[2] ترمذی ج: ۱ ص: ۱۰۵ باب ماجاء فی من یموت یوم الجمعۃ، مسند احمد ج: ۲ ص: ۱۶۹، مشکوٰۃ ص ۱۲۱۔

"مَنْ مَّاتَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْلَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اُجِيْرَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَجَآءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلَيْهِ طَابِعُ الشُّهَدَآءِ" [1]

جو مسلمان جمعہ کے دن یا شبِ جمعہ میں فوت ہو جاتا ہے اسے عذاب قبر سے پناہ دے دی جاتی ہے اور وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس پر شہیدوں کی مہر ہوگی۔

حضرت عطاء بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"مَامِنْ مُّسْلِمٍ اَوْ مُسْلِمَةٍ يَّمُوْتُ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اَوْيَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلَّا وُقِيَ عَذَابَ الْقَبْرِ وَفِتْنَةَ الْقَبْرِ وَلَقِيَ اللّٰهَ وَلَاحِسَابَ عَلَيْهِ وَجَآءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَعَهٗ شُهُوْدٌ يَّشْهَدُوْنَ لَهٗ بِالْجَنَّةِ اَوْ طَابِعٌ" [2]

جو مسلمان مرد یا عورت شبِ جمعہ میں یا جمعہ کے دن فوت ہوتا ہے وہ عذابِ قبر اور فتنۂ قبر سے محفوظ کر دیا جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس پر کسی قسم کا حساب نہیں ہوگا اور قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے ساتھ گواہ ہوں گے جو اُس کے لیے جنت کی گواہی دیں گے یا مہر ہوگی۔

شبِ جمعہ کی یہ فضیلت جمعہ کے دن اور رمضان المبارک میں فوت ہو جانے والے شخص کے لیے بھی ثابت ہے، چنانچہ جو مسلمان جمعہ کے دن یا رمضان المبارک میں فوت ہو جائے اُسے بھی عذابِ قبر نہیں ہوتا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر پیش آنے والے بعض سوالوں کا جواب بھی ذکر کر دیا جائے۔

(۱) سوال: شبِ جمعہ، جمعہ کے دن اور رمضان میں مرنے والے کو صرف ان ایّام میں عذاب نہیں ہوتا یا قیامت تک معافی مل جاتی ہے؟

جواب: مومن کو قیامت تک معافی مل جاتی ہے۔

---

[1] شرح الصدور، ص: ۲۰۹ [2] شرح الصدور ص: ۲۰۹ باب من لا یسئل فی القبر

(۲) سوال : ان ایّام میں تو سود خور شرابی اور بدکار بھی مرتے ہیں، کیا اُن سے بھی عذابِ قبر مرتفع ہو جاتا ہے؟

جواب : اس سوال کے مندرجہ ذیل جواب ہو سکتے ہیں۔

① دوسری نصوص کے پیشِ نظر اس حدیث میں اجتناب عن الکبائر کی قید ہے لہٰذا جو کبائر سے بچتا ہوگا وہی عذابِ قبر سے بچے گا۔

② بعض بدکار بلاحساب بھی جنّت میں جائیں گے، جن کے لیے یہ سعادت مقدر ہے ان ایّام میں صرف انہی کی موت واقع ہوتی ہے۔

③ ان ایّام میں موت سے صرف عذابِ قبر معاف ہے عذابِ آخرت نہیں اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان ایّام کی برکت کے سوا کسی اور عمل کی بدولت عذابِ قبر سے بچ گیا تو آئندہ منازل سہل ہوں گی۔

(۳) سوال: ان ایّام میں تو کافر بھی مرتے ہیں تو کیا وہ بھی عذابِ قبر سے محفوظ ہو جاتے ہیں؟

جواب : ان ایّام میں اگر کافر مرجائے تو اُسے صرف اِن ایّام میں عذابِ قبر نہیں ہوتا ان کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔

(۴) سوال : اگر کوئی فوت تو جمعرات کے دن میں ہُوا اور تدفین اُس کی شبِ جمعہ میں یا جمعہ کے دن عمل میں آئی تو کیا اس سے بھی عذابِ قبر مرتفع ہو جائے گا؟

جواب : یہ وعدہ جمعہ کے دِن اور جمعہ کی رات میں موت پر ہے، دفن پر نہیں البتہ عذابِ قبر چونکہ دفن کے بعد شروع ہوتا ہے اور مسلم میت پر شب جمعہ سے حشر تک عذاب مرتفع ہو جاتا ہے اس لیے ایسا شخص عذابِ قبر سے محفوظ رہے گا

ابن البزاز فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| "اَلسُّؤَالُ فِيْمَا يَسْتَقِرُّ | میت سے سوال وجواب اسی جگہ ہوتا ہے |
| فِيْهِ الْمَيِّتُ حَتّٰى لَوْ | جو جگہ میت کا مستقر بنتی ہے یہی وجہ ہے |
| اَكَلَهُ سَبُعٌ فَالسُّؤَالُ | کہ اگر کسی کو کسی درندے نے کھالیا تو اس |
| فِيْ بَطْنِهٖ فَاِنْ جُعِلَ | سے سوال وجواب اس درندے کے پیٹ |
| فِيْ تَابُوْتٍ اَيَّامًا | میں ہوگا اور اگر کسی میت کو چند دن تابوت |

لِنَقْلِهٖ اِلٰی مَکَانٍ آخَرَ لَا یُسْئَلُ مَالَهٗ یُدْفَنْ" میں رکھا گیا کسی دوسری جگہ لے جانے کے لیے تو جب تک اس میّت کو دفنا نہیں دیا جائے گا اس سے سوال وجواب نہیں ہوگا[1]

## حضرت یعقوب علیہ السّلام نے صاحبزادوں کے لیے طلبِ استغفار کو شبِ جمعہ پر موقوف رکھا

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ برادرانِ یوسف نے اخیر میں جب اپنی خطاؤں کا اقرار کر کے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السّلام سے عرض کیا کہ ہماری خطاؤں کی بخشش کی دعا کر دیجیے تو آپ نے فرمایا تھا "سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْ" عنقریب میں تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا۔ گویا آپ نے فوراً ہی مغفرت طلب نہیں کی تھی، بلکہ وعدہ کر لیا تھا کہ عنقریب کروں گا۔ سوال ہوتا ہے کہ آپ نے برادرانِ یوسف کے لیے مغفرت کب طلب کی؟ اس سلسلہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے دو وقت منقول ہیں۔ ۱۔ ایک یہ کہ آپ نے طلبِ مغفرت وقتِ سحر کی کہ یہ قبولیتِ دعا کا وقت ہے۔ ۲۔ دوسرے یہ کہ آپ نے طلبِ مغفرت شبِ جمعہ پر موقوف رکھی، جب شبِ جمعہ آئی تو آپ نے صاحبزادوں کے لیے مغفرت طلب کی[2]

حضرت عکرمہؒ حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہما سے سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ (عنقریب میں تمہارے لیے مغفرت طلب کروں گا) کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کا مطلب یہ تھا کہ شبِ جمعہ میں مغفرت طلب کروں گا۔[3]

حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام بیس برس سے بھی زیادہ عرصہ تک ہر شبِ جمعہ صاحبزادوں کے لیے مغفرت طلب کرتے رہے۔[4]

حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام نے دعاءِ مغفرت کو شبِ جمعہ کے وقتِ سحر پر مؤخر کیے رکھا، پھر ایسا اتّفاق ہوا کہ اُسی شب جمعہ دسویں محرم کی رات بھی

---

[1] اس سوال وجواب کی تفصیل کے لیے احسن الفتاوٰی ج ۳، ص ۱۹۷ تا ۱۹۹ ملاحظہ فرمائیں یہ معمولی تغیر کے ساتھ اُسی سے ماخوذ ہیں

[2] روح المعانی ج ۵، ص ۵۵ [3] التفسیر المظہری (عربی) ج ۵ ص ۲۰۰

[4] التفسیر المظہری ج ۵ ص ۲۰۰

ہوئی[1]

## حفظِ قرآن کے لیے شبِ جمعہ میں کیا جانے والا ایک خاص عمل

حدیث شریف میں آتا ہے۔

"حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر تھے کہ علی بھی آگئے اور آکر عرض کرنے لگے کہ (یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم) میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں قرآن پاک میرے سینے سے نکلا جاتا ہے جو یاد کرتا ہوں وہ محفوظ نہیں رہتا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے آپ سے فرمایا کہ اے ابوالحسن (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) کیا میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھا دوں کہ جن کے ذریعہ اللہ تمہیں بھی نفع دے گا اور جنہیں تم وہ کلمات سکھاؤ گے اُنھیں بھی نفع دے گا اور جو تم سیکھو گے وہ تمہارے سینے میں محفوظ رہے گا، (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ جی ہاں یا رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم ضرور سکھلا دیجیے) چنانچہ آپ نے مجھے بتلایا کہ جب شبِ جمعہ آئے اور تم رات کے آخری تہائی حصّے میں اُٹھ سکو تو یہ بہت ہی اچھا ہے کہ یہ وقت ملائکہ کے نازل ہونے کا ہے اور دُعا اس میں خاص طور سے قبول ہوتی ہے، اسی وقت کے انتظار میں میرے بھائی یعقوب علیہ السّلام نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ (عنقریب میں تمہارے لیے اپنے رَبّ سے مغفرت طلب کروں گا) آپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شبِ جمعہ آنے دو پھر استغفار کروں گا۔ اگر اس وقت جاگنا دُشوار ہو تو آدھی رات کے وقت، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو شروع رات ہی میں کھڑے ہو کر چار رکعات نفل اس طرح پڑھو کہ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ یٰسین پڑھو، دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ دخان پڑھو، تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ الٓمٓ سجدہ پڑھو اور چوتھی رکعت میں

---

[1] التفسیر المظہری، ج ۵، ص، ۲۰۰۔

سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ ملک پڑھو، جب التحیات سے فارغ ہوجاؤ تو اوّل حق تعالیٰ شانہٗ کی خُوب خُوب حمد و ثناء کرو پھر مجھ پر اور تمام انبیاء کرام پر درود بھیجو پھر تمام مؤمن مرد و عورت کے لیے نیز اپنے مُسلمان بھائیوں کے لیے جو مر چکے ہیں استغفار کرو اور اُس کے بعد یہ دُعا پڑھو۔

"اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِتَرْکِ الْمَعَاصِیْ اَبَدًا مَّا اَبْقَیْتَنِیْ وَارْحَمْنِیْ اَنْ اَتَکَلَّفَ مَالَا یَعْنِیْنِیْ وَارْزُقْنِیْ حُسْنَ النَّظَرِ فِیْمَا یُرْضِیْکَ عَنِّیْ، اَللّٰھُمَّ بَدِیْعَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ وَالْعِزَّۃِ الَّتِیْ لَا تُرَامُ اَسْئَلُکَ یَا اَللّٰہُ یَا رَحْمٰنُ بِجَلَالِکَ وَنُوْرِ وَجْھِکَ اَنْ تُلْزِمَ قَلْبِیْ حِفْظَ کِتَابِکَ کَمَا عَلَّمْتَنِیْ وَارْزُقْنِیْ اَنْ اَتْلُوَہٗ عَلَی النَّحْوِ الَّذِیْ یُرْضِیْکَ عَنِّیْ اَللّٰھُمَّ بَدِیْعَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ وَالْعِزَّۃِ الَّتِیْ لَا تُرَامُ اَسْئَلُکَ یَا اَللّٰہُ یَا رَحْمٰنُ بِجَلَالِکَ وَنُوْرِ وَجْھِکَ اَنْ تُنَوِّرَ بِکِتَابِکَ بَصَرِیْ وَاَنْ تُطْلِقَ بِہٖ لِسَانِیْ وَاَنْ تُفَرِّجَ بِہٖ عَنْ قَلْبِیْ وَاَنْ تَشْرَحَ بِہٖ صَدْرِیْ وَاَنْ تَغْسِلَ بِہٖ بَدَنِیْ فَاِنَّہٗ لَا یُعِیْنُنِیْ عَلَی الْحَقِّ غَیْرُکَ وَلَا یُؤْتِیْہِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ"

ترجمہ: "اے الٰہ العالمین مجھ پر رحم فرما کہ جب تک میں زندہ رہوں گناہوں سے بچتا رہوں اور مجھ پر رحم فرما کہ میں بیکار چیزوں میں کلفت نہ اُٹھاؤں اور اپنی مرضیات میں خوش نظری مرحمت فرما، اے اللہ اے زمین اور آسمانوں کے بے نمونہ پیدا کرنے والے، اے عظمت اور بزرگی والے اور اس غلبہ یا عزّت کے مالک جس کے حصول کا ارادہ بھی ناممکن ہے اے اللہ اے رحمٰن میں تیری بزرگی اور تیری ذات کے نُور کے طفیل تجھ سے مانگتا ہوں کہ جس طرح تُو نے اپنی کلام پاک مجھے سکھا دی اسی طرح اس کی یاد بھی میرے دل سے چسپاں کر دے اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اس کو اس طرح پڑھوں جس سے تو راضی ہوجاوے اے اللہ زمین اور آسمانوں کے بے نمونہ پیدا کرنے والے، اے عظمت اور بزرگی والے

اور اس غلبہ یا عزّت کے مالک جس کے حصول کا ارادہ بھی ناممکن ہے، اے اللہ اے رحمٰن مَیں تیری بزرگی اور تیری ذات کے نُور کے طفیل تجھ سے مانگتا ہوں کہ تو میری نظر کو اپنی کتاب کے نُور سے منوّر کر دے اور میری زبان کو اس پر جاری کر دے اور اس کی برکت سے میرے جسم کے گناہوں کا میل دھو دے کہ حق پر تیرے سوا میرا کوئی مدد گار نہیں اور تیرے سوا میری یہ آرزو کوئی پُوری نہیں کر سکتا اور گناہوں سے بچنا یا عبادت پر قدرت نہیں ہو سکتی مگر اللہ برتر و بزرگ والے کی مدد سے۔

پھر آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اے ابوالحسن (علی) اس عمل کو تین جمعہ یا پانچ جمعہ یا سات جمعہ کرو۔ اللہ کے حُکم سے دُعا ضرور قبول ہو گی، قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے کسی مومن سے بھی قبولیتِ دُعا نہ چوکے گی، حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) کو پانچ یا سات جمعے ہی گزرے ہوں گے کہ وہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اسی جیسی مجلس میں حاضر ہُوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پہلے میں تقریباً چار آیتیں پڑھتا تھا وہ بھی مجھے یاد نہیں ہوتی تھیں اور اب تقریباً چالیس آیتیں پڑھتا ہوں اور ایسی ازبر ہو جاتی ہیں کہ گویا قرآن پاک میرے سامنے کھُلا ہُوا رکھا ہے اور پہلے مَیں حدیث سُنتا تھا اور جب اس کو دوبارہ کہتا تھا تو ذہن میں نہیں رہتی تھی اور اب احادیث سُنتا ہوں اور جب دوسروں سے نقل کرتا ہوں تو ایک لفظ بھی نہیں چھوٹتا آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس موقعہ پر فرمایا رب کعبہ کی قسم ابوالحسن (علی) مومن ہے۔"[1]

**شبِ جمعہ میں جماع** ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

"مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَغَسَّلَ وَ بَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَدَنَا وَاسْتَمَعَ وَاَنْصَتَ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ خُطْوَةٍ يَخْطُوْهَا اَجْرُ

جو شخص جمعہ کے دن خود نہائے اور نہلائے اور سویرے سے (جامع مسجد) جائے (تاکہ) شروع سے خطبہ پالے، اور امام کے قریب بیٹھے اور خاموشی سے خطبہ سُنے تو اس کے

---

[1] جامع ترمذی ج ۲ ص ۱۹۷ طبع ایچ ایچ سعید کمپنی کراچی، امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے مستدرک حاکم ج

سَنَةٍ صِيَامُهَا وَ قِيَامُهَا[1] ہر قدم کے بدلے ایک سال کے روزوں اور رات میں عبادت کرنے کا ثواب لکھا جائے گا

اس حدیث مبارک میں بہت سے محدثین نے نہلانے سے مراد یہ لیا ہے کہ شبِ جمعہ کو آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرے تاکہ اس پر غسل فرض ہو جائے اور وہ بھی جمعہ کے دن نہائے، اس لحاظ سے شبِ جمعہ میں اپنی بیوی سے صحبت کی ایک گونہ فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

حضرت نواب قطب الدین رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اس شب صحبت کی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے وسوسہ زنا کا (خواہ زنا آنکھ اور کان ہی کا کیوں نہ ہو) دل میں نہیں آتا، اور حضورِ نماز میں خوب ہوتا ہے۔

**شبِ جمعہ میں مزارات پر جانا** اکثر لوگ مرد ہوں یا عورتیں جمعہ کی رات اولیاء کرام کے مزارات پر حاضری کو ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ دور دور سے لوگ اس غرض کے لیے آتے ہیں اور منکرات و مناہی کا ارتکاب کرتے ہیں انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ اوّل تو اس رات میں مزارات پر جانے کو ضروری سمجھنا ناجائز ہے، کیونکہ شرعًا اس کا کوئی ثبوت نہیں، دوسرے عورتوں کو مزارات پر جانا جائز نہیں جیسا کہ کتبِ فقہ و فتاوٰی میں تفصیلًا مذکور ہے اسلیئے نہ تو اس شب میں مزارات پر حاضری کو ضروری خیال کرنا چاہیے اور نہ ہی عورتوں کو مزارات پر جانا چاہیے۔

**شبِ جمعہ کی ناقدری** شبِ جمعہ کے جو فضائل بیان ہوئے ہیں اُن کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے، اللہ کو راضی کیا جائے اور اُس سے خیر و برکت، مغفرت و عافیت، صحت و سلامتی کی دُعائیں مانگی جائیں تاکہ اس رات کی برکت سے وہ دُعائیں قبول ہوں، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ اس رات کی انتہائی ناقدری کرتے ہوئے لوگ اسے لہو و لعب کی نذر کر رہے ہیں۔ اکثر لوگ ساری ساری رات ٹیلیویژن اور وی سی آر پر گندی و غلیظ فلمیں دیکھتے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ کیرم، شطرنج اور دیگر کھیل تماشوں میں ساری رات گزار دیتے ہیں۔ نوجوان نسل جگہ جگہ فلڈ لائٹیں لگا کر ساری رات میچ کھیلتی رہتی ہے جس سے اپنا وقت تو ضائع کرتے ہی ہیں دوسروں کا راحت و آرام بھی برباد کرتے ہیں۔ ساری رات اس طرح گزرتی ہے۔ صبح سحر کے وقت غفلت کی نیند سو جاتے ہیں اور اس طرح اس رات کی

(باقی صـ۵۵ پر)

[1] ترمذی، ج:۱ ص:۱۱۱، ابوداؤد، ج:۱، ص:۵۰، نسائی ج:۱، ص:۱۵۵، ابن ماجہ ص:۷۷، مشکوٰۃ ص:۱۲۲۔

مولانا سیّد ریاست علی مرحوم

# سادات و علویین

## اور اُن کی سیادت و شرافت کی نسبتیں

۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ ایک صاحب نے مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ سے سوال کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری ازواج کی اولاد محمد بن حنفیہ وغیرہ کی اولاد کو "تذکرۃ السادات" اور دوسری کتابوں میں "سیّد" سے ملقب کیا گیا ہے اور صرف بطنی فرق بتایا گیا ہے لیکن بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے وہ سیادت کی نسبت کو صرف حضراتِ حسنینؓ اور ان کی اولاد کے لیے مخصوص جانتے ہیں اور علویین کو شیوخ کہتے ہیں، حالانکہ حضرت علیؓ کی اولاد ہونے میں یہ دونوں برابر ہیں اور میرے خیال میں ہر شخص کو اپنے باپ ہی کی طرف منسوب کرنا درست ہے، اس لیے ساداتِ علویین و فاطمیین میں کوئی فرق نہیں ہے، برائے کرم تفصیل سے مطلع فرمائیں، باعثِ کرم ہوگا۔

ذیل میں جو تحریر پیش کی جا رہی ہے، وہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہے۔

حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما کی اولاد، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد ہونے کے سبب سے نسبتِ سیادت سے منسوب نہیں بلکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد گرامی "اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ" (مستدرک حاکم) کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اپنے کو "سیّد" سے ملقب کرتے ہیں، یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ ہر شخص نسب میں اپنے آبا کی طرف منسوب ہوتا ہے اس لیے سادات کا نسلی انتساب حضرت علیؓ کی جانب ہوگا نہ کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف، اور جب انتساب حضرت علیؓ کی جانب ہوگا تو یہ نسبت اُن کی تمام ازواج کی اولاد کو یکساں حاصل ہے لیکن عموماً اُصولوں اور قاعدوں میں استثناء بھی ہوا کرتا ہے اور اتفاق سے یہ استثناء یہاں موجود ہے جس سے یہ شبہہ رفع ہو جاتا ہے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے، آپ نے فرمایا۔

كُلُّ بَنِيْ آدَمَ يُنْتَمُوْنَ اِلٰى عُصْبَةٍ اَبِيْهِمْ اِلَّا وُلْدَ فَاطِمَةَ فَاِنِّيْ اَنَا اَبُوْهُمْ وَاَنَا عُصْبَتُهُمْ۔ (طبرانی)

تمام بنی آدم اپنے آباء کی قرابت کی طرف منسوب ہیں، سوائے اولاد فاطمہ کے ہیں اُن کا باپ ہوں اور مجھ سے اُن کی دادھیالی قرابت ہے۔

اس حدیث کی سند کسی قدر مجروح ہے، لیکن اس کی مؤید ایک دوسری روایت طبرانی ہی میں صحیح سند سے مروی ہے، اس میں آپ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ ذُرِّيَّةَ كُلِّ نَبِيٍّ فِيْ صُلْبِهٖ وَاِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ ذُرِّيَّتِيْ فِيْ صُلْبِ عَلِيٍّ (المقاصد الحسنہ سخاوی ص: ۱۵۰)

اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی اولاد، اس کے صلب میں رکھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اولاد کو علی کے صلب میں رکھا۔

نیز آپ نے فرمایا

هٰذَانِ ابْنَايَ وَابْنَا بِنْتِيْ اَللّٰهُمَّ تَعْلَمُ اَنِّيْ اُحِبُّهُمَا فَاَحِبَّهُمَا

یہ دونوں میرے بیٹے ہیں اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں، اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں ان کو چاہتا ہوں تو بھی اُنھیں اپنی شفقت اور محبّت کے سایہ میں لے۔

اسی طرح آپ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کرکے فرمایا:

اَمَّا اَنْتَ يَا عَلِيُّ فَخَتَنِيْ وَاَبُوْ وَلَدَيَّ اَنْتَ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْكَ۔ (نسائی در خصائص امیر المومنین علیؓ، ص ۳۶)

اے علی! تم تو میرے داماد ہو، میرے لڑکے کے والد ہو، تم مجھ سے ہو، اور میں تم سے ہوں۔

خانوادۂ سادات کے لقب "سیّد" اختیار کرنے کی وجہ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبان مبارک سے اس خانوادہ کے بزرگوں کے لیے جُدا جُدا یہ لقب عطا ہوئے حضرت فاطمہؓ کے متعلق "سَيِّدَةُ نِسَاءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ" فرمایا، حضرات حسنینؓ کو "سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ" اور حضرت حسینؓ کو "سَيِّدُ النَّاسِ" فرمایا، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ نے ایک مرتبہ "سَيِّدُ الْعَرَبِ" کے لقب سے یاد فرمایا، اس پر کہا گیا کہ "سَيِّدُ الْعَرَبِ" تو آپ ہی ہیں، اس کے

جواب میں آپ نے فرمایا اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ، یعنی "میں اولادِ آدم کا سردار ہوں" (حاکم) لیکن ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا فرمائے ہوئے، یہ القاب ذاتی ہیں، خاندانی اور موروثی نہیں، اور نہ شریعت کی نگاہ میں اس سے کسی کو کوئی وجہ امتیاز و افتخار حاصل ہے کہ ایک دوسرے موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا: "اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ" پھر قرآن مجید کا یہ فیصلہ ناطق موجود ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ "یعنی اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے، جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے" مگر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا | یعنی ہم نے تم کو گروہوں اور قبیلوں میں |
| وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ | بنایا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ |

اس سے اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ انسانوں کا شعوب، قبائل اور خانوادوں کی شناخت کو قائم رکھنا اسلام کی نگاہ میں ناروا نہیں، البتہ اس کو وجہِ امتیاز اور باعثِ فخر و مباہات سمجھنا صحیح نہیں ہے چنانچہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی لوگوں نے خانوادوں کی باہمی شناخت کو قائم رکھا، لیکن بعض خانوادوں کو "شرافت و سیادت" کی نسبتیں کیونکر حاصل ہو گئیں۔ ہمارے خیال میں اُن کا تعلق تمامتر استعمال اور رواج سے ہے اور جو لوگ ان خانوادوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سیادت کی نسبتیں استعمال کرتے ہیں وہ محض ان خانوادہ سے اپنی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں نہ کہ ان نسبتوں کے معنوی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کسی برتری اور تفوق کا پہلو بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کثرتِ استعمال اور عام رواج سے یہ نسبتیں ان خانوادوں سے وابستہ ہو گئی ہیں، لیکن جب یہ نسبتیں ان سے وابستہ ہو چکی ہیں، تو رفعِ التباس کے لیے کسی دوسرے خانوادہ کے کسی فرد کو ان نسبتوں سے احتراز رکھنا زیادہ مناسب ہے۔

عرب میں ایامِ جاہلیت اور آغازِ اسلام کے وقت قبائل کے سرداروں کو "اَشراف" کے لقب سے ملقب کیا جاتا تھا، جیسے۔

| | |
|---|---|
| فَذُکِرَ اَنَّ اَشْرَافَ | کہا گیا ہے کہ آپ کی قوم کے سردار (اشراف) |
| قَوْمِہٖ اجْتَمَعُوْا لَہٗ یَوْمًا۔ | آپ کے پاس ایک دن جمع |
| (طبری، ج: ۳، ص: ۱۱۹۱) | ہوئے۔ |

ظاہر ہے کہ اس جملہ میں اشرافِ قوم سے مراد قریش کے سردارانِ قبائل ہیں۔

اس کے بعد عہدِ اسلام میں ابتداءً لفظ اشراف کا اطلاق طالبین وعباسیین پر کیا جاتا تھا، اور علّامہ ذہبی نے بھی اپنی تاریخ الاسلام میں الشریف ... العباسی ... الشریف ... العقیلی ... الشریف ... الجعفری لکھا ہے، لیکن دوسری طرف عبّاسیوں ہی کے دَور میں "الشریف" کا لقب رفتہ رفتہ آلِ علی کے لیے اس زمانہ میں مخصوص ہوتا گیا جب وہ سلطنت کے مختلف میں بغاوتیں کر رہے تھے اور طبرستان وعرب کے بعض حصّوں میں سلطنتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے، اس کے بعد سیوطی کا بیان ہے کہ "الشریف" کا لقب آلِ علی کے لیے مخصوص ہوگیا عام ازیں کہ وہ حسنی ہوں یا حسینی، جعفری ہوں یا علوی سب اسی لقب سے ملقب ہوتے تھے، اس لیے کہ "الشریف" خود حضرت علی رضؓ کے القاب میں داخل تھا، محب الدین الطبری کی "الریاض النضرۃ" میں ہے۔

و یلقب ایضا ... بالشریف (ج ۲ ص ۱۵۵) اور شریف سے بھی ملقب تھے۔

پھر فاطمیین مصر نے اپنی حکومت کے زمانہ میں لقب "الشریف" کو حسنی وحسینی سادات کے لیے مخصوص کر دیا تھا، یہاں تک کہ جو اوقاف صرف اشراف کے نام سے وقف ہوتے تھے ان کا اطلاق عرف عام کا لحاظ رکھ کر صرف حسنی وحسینی سادات پر کیا جاتا تھا، اس میں علوی داخل نہ سمجھے جاتے تھے۔

لقب "السیّد" کے استعمال اور رواج پانے کی سرگزشت بھی تقریباً لقب "الشریف" کے مثل ہے، ابتداءً سیّد کا لقب اُنھیں عطا کیا جاتا تھا جو اپنے کسی فن میں کمال رکھتے تھے اور یہ عہدِ جاہلیّت سے عرب کا عام استعمال تھا۔ عہدِ اسلام میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جیسا کہ اُوپر گزرا، خانوادۂ نبوّت کے مختلف بزرگوں کو اس لقب سے ملقب فرمایا اور اپنی ذات گرامی کے لیے بلافخر "سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ" فرمایا، ان مناسبتوں سے یہ لقب خانوادۂ نبوّت سے متوسلین کے لیے استعمال کیا جانے لگا، چنانچہ "عمدۃ الطالب فی انساب آلِ ابی طالب" میں اکثر بزرگوں کو اس لقب "السید" سے ملقب کیا گیا ہے (ص ۵۱، ۵۲، ۵۴، ۵۹، ۶۵، وغیرہ) علّامہ ذہبی نے تاریخ الاسلام میں حضرت امام علی بن محمدؒ کو جو بارہویں امام کہے جاتے ہیں، اس لقب سے ملقب

کیا ہے اور کبھی بعض آل علیؓ "السیّد الشریف" دونوں لقب ملا کر ملقب کیے جاتے تھے، مثلاً خزرجی لکھتا ہے:

"وفی هذا التاریخ وصل الشریف السید محمد بن الهادی المعروف بالقطابری الی الاشراف فاراد وا ان یقدموه اماماً وکان کاملاً فامتنع من ذلك (العقود اللولویہ ج ۱ ص ۳۱۴)

اسی تاریخ کو شریف سیّد محمّد بن ہادی معروف بہ قطابری، اشراف کے پاس پہنچے، ان لوگوں نے اُن کو امام بنانا چاہا مگر وہ صاحبِ کمال تھے، اس سے محترز رہے۔

اس طرح عرب و مصر میں الشریف اور السیّد کے القاب فاطمیین کے لیے رفتہ رفتہ مخصوص ہو گئے اور نہار نے تصریح کی کہ اگر "اشراف وسادات" کے نام کے اوقاف ہوں تو اُن سے مراد فاطمیین ہی ہوں گے، اور یہی اطلاق موجودہ زمانہ تک قائم ہے۔ امین ریحانی لکھتے ہیں۔

"لَا یُدْعٰی سَیِّدٌ فِی الْیَمَنِ غَیْرُ مَنْ کَانَ مِنَ السُّلَالَةِ النَّبَوِیَّةِ" (ملوک العرب ج ۱ ص ۹۲)

جو شخص خانوادۂ نبوّت کی نسل سے نہ ہو، اُس کو یمن میں سیّد نہیں کہہ سکتے۔

پھر خاص حجاز میں حسنی و حسینی کے امتیاز کے لیے حسنیوں کو "الشریف" اور "حسینیوں" کو سیّد سے ملقب کرتے ہیں پچھلے دور میں بھی یہی تھا اور اس زمانہ میں بھی یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے، ایران میں سادات کو خواہ حسنی ہوں یا حسینی، سیّد اور "میر" کے لقب سے ملقب کرتے ہیں اور یہی رواج ٹرکی اور ہندوستان میں بھی ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام)

ان تفصیلات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اسلام کے عہدِ قدیم سے دورِ حاضر تک لقب "سیّد" آلِ علیؓ کے لیے نہیں، بلکہ آلِ نبی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لیکن ہر آلِ نبیؐ آلِ علی بھی ہے مگر ہر آلِ علی، آلِ نبی نہیں، حضرت علیؓ کی دیگر ازواج کی اولاد کے لیے نسبتِ علوی پہلے سے جاری ہے اور اس زمانہ میں بھی عام طور پر اس کا رواج قائم ہے۔

مولانا مجاہد الاسلام القاسمی
مدرسہ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر

# "خلافت معاویہؓ و یزید"

## "ایک جائزہ"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا تقاضا ہے کہ آپ کے صحابہ و اہلِ بیت سے بھی سچی محبت کی جائے۔ اہلِ سنت والجماعت ہمیشہ سے اسی اُصول پر کاربند رہے ہیں، بدقسمتی سے مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے تحقیق کے نام سے تشکیک کو جنم دیا ہے۔ موجودہ دور میں ایسے لوگوں کے سرگروہ محمود احمد عباسی ہیں۔ اُنھوں نے اہلِ بیت، بالخصوص سیدنا علیؓ اور امام حسینؓ کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا کی ہیں ۱۹۵۹ء میں جب اُن کی انتہائی زہریلی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" چھپی تو ملک میں بڑا انتشار پھیلا اور بہت سے سیدھے سادے لوگ اس کتاب کی وجہ سے گمراہ ہوئے، علماء کرام نے اسی وقت اس کے بہت سے جواب لکھے، ایک جواب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے اُس تاریخی کتاب کے حوالے سے لکھا جس پر محمود احمد عباسی صاحب کو اعتماد تھا۔ اِس جواب میں مولانا نے عباسی صاحب کے نظریات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ آج کل دیکھنے میں آرہا ہے کہ بہت سے جدّت پسند اور تحقیق کے مدّعی نوجوان عباسی صاحب کے مکروہ اور گمراہ کُن نظریات سے متأثر ہو رہے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کی وہ تحریر دوبارہ شائع کر دی جائے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ تحریر بہت سے گُم کردہ راہوں کی رہنمائی اور ہدایت کا سبب بنے گی۔

مولانا محمود احمد عباسی صاحب کی تالیف "خلافت معاویہ و یزید" اس وقت پُورے ملک میں محلِ بحث و نظر بنی ہُوئی ہے۔ راقم الحروف نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا اور جو کچھ محسوس کیا اُسے پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔

کتاب کی ابتدا "عرضِ مؤلف" سے ہوتی ہے۔ مصنّف نے پیشِ لفظ میں جہاں عہدِ بنو امیہ کی برکات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہاں تمام مستند تاریخوں کے درجۂ استناد کو بھی چیلنج کیا ہے۔ مصنّف کے نقطۂ نظر سے بنو امیّہ کے بارے میں دوسری صدی ہجری میں وضعی روایات اور من گھڑت افسانوں کا پہاڑ کھڑا کر دیا گیا۔ اس طرح اسلامی تاریخ کی جتنی معتمد کتابیں ہیں ان کو بیچ سے یک قلم نکال دیا گیا ہے، اگر مصنف کے اس نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر نہایت سہولت کے ساتھ تاریخ کے ان تمام اہم واقعات کا انکار کیا جا سکتا ہے جن پر شک و وہم کا کوئی گزر نہیں۔ تحقیق و تنقید کا یہ طریقہ تو صحیح ہے کہ "مخالف و موافق" آراء و اقوال کو سامنے رکھ کر اُصولِ روایت اور اُصولِ درایت کی بُنیاد پر سچ کو جھوٹ سے الگ کیا جائے اور صحیح صُورتِ حال کی تحقیق کی جائے لیکن تحقیق کا یہ طریقہ بالکل انوکھا ہے کہ ایک رائے پہلے سے قائم کر لی جائے پھر اگر اس مزعومہ نقطۂ نظر کے خلاف کوئی بات کسی مصنّف نے لکھ دی ہے تو اس روایت کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کی خاطر اس تصنیف اور اس کے تمام مواد کو

غلط قرار دیا جائے۔ "تاریخ طبری" یا اس طرح کی دوسری تاریخیں ظاہر ہے کہ انسانوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جن کی پیش کردہ معلومات کو لَا رَیْبَ فِیْہِ کی سند حاصل نہیں ہے۔ ان میں صحیح غلط کا احتمال ہے بنا بریں صحیح طریق کار یہ ہے کہ ان "روایات" پر جرح و نقد کیا جائے اور صحیح کو غلط سے الگ کیا جائے لیکن اگر ان تمام روایات کو غلط قرار دینے کے لیے امام ابن جریر طبری جیسے امام اہل سُنت والجماعت پر "شیعی اور غالی شیعی" کا لیبل لگا دیا جائے تو اُسے صحیح طریق کار نہیں کہا جا سکتا۔

مصنّف نے اس پوری جماعتِ مورّخین میں سے صرف "ابن خلدون" کو بخشا ہے اور ان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"البتہ ایک منفرد مثال علّامہ ابن خلدون کی ہے جنھوں نے اپنے شہرۂ آفاق مقدمۂ تاریخ میں بعض مشہور وضعی روایات کو نقد و درایت کے معیار سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اور نام نہاد مورّخین کے بارے میں صاف کہا ہے کہ تاریخ کو خرافات اور واہی روایات سے انھوں نے لتھیڑ ڈالا" (صک)

صـ۱۵ سے مولوی علی احمد عباسی کے قلم سے "تعارف" ہے اس میں بھی تاریخ کو دوسری صدی ہجری میں وضعی روایات سے بھردینے اور تاریخِ اسلام کو مسخ کر دینے کا الزام قائم کیا گیا ہے اور پھر سبائی تحریک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ پھر جناب تمنّا عمادی کا لکھا ہوا مقدمہ ہے اس میں ان تعصبات اور غلو پر تبصرہ کیا گیا ہے جو تاریخی روایات پر اثر انداز رہے ہیں۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔

اصل کتاب کے بنیادی مباحث یہ ہیں کہ یزید خلیفہ عادل ہے، وہ اعلیٰ کردار، بلند کیرکٹر اور مختلف خوبیوں کا حامل تھا۔ اس کی خلافت جائز تھی، اس پر تمام صحابہؓ کا اتّفاق تھا اور حضرت حسین بن علیؓ کا خروج قطعاً جائز نہیں تھا۔ ان کے خروج کی حیثیت "خلیفہ عادل کے مقابلے میں کسی باغی کے خروج کی ہے"۔ اُن کا قتل محض ایک اتفاقی واقعہ تھا جو خود اُن کے سبائی ساتھیوں کی وجہ سے پیش آگیا۔

کتاب میں ضمنی طور پر کہیں کہیں خود حضرت علیؓ پر بھی بے جا نقد کیا گیا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ سے موازنہ کرتے ہوئے کہیں لکھا گیا ہے کہ "حضرت علیؓ کی بیعت ہی مکمل نہیں ہوئی تھی"۔

"اُنھوں نے کبھی کوئی ملک فتح نہ کیا" اُن کے زمانہ میں کبھی جہاد نہ ہوا" اُپنے زمانہ خلافت میں کبھی اُنھوں نے حج نہ کیا اور نہ امارتِ حج کے فرائض ادا کیے" یہی نہیں بلکہ اُن کی اولاد میں سے بھی کبھی کسی نے امارتِ حج کے فرائض ادا نہیں کیے۔ بخلاف حضرت معاویہؓ کے اور اُن کے لائق فرزند امیر یزید کے کہ اُنھوں نے تین بار امارات حج کے فرائض ادا کیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح بعض جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنّف حضرت علیؓ پر حضرت معاویہؓ ہی کو نہیں بلکہ یزید کو بلند کرنا چاہتے ہیں۔ ایک جگہ حضرت معاویہؓ کے فضائل کا ذکر کرتے کرتے سیاست و حکومت میں حضرت عمرؓ سے بھی اُنہیں بڑھا دیتے ہیں۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں تمام علماء سلف کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ ہم اُن کے باہمی نزاعات کے بارے میں "کُفِّ لِسَان" کریں اور خواہ مخواہ کے لیے "تفصیل و موازنہ" کی بحثوں سے اپنے زبان و قلم کو آلودہ نہ کریں۔

ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ، معاویہؓ و عمرو بن العاصؓ، طلحہؓ و زبیرؓ، حسینؓ و حسنؓ، یہ سب آفتاب و ماہتاب تھے۔ ان سب نے آفتابِ نبوّت سے روشنی حاصل کی تھی اور سب ہمارے لیے "شمع ہدایت" تھے، قرآن کریم نے اُنھیں۔

"رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ"

کا امتیاز بخشا اور جناب رسالت مآبؐ نے

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ، بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ

فرما دیا۔

انہیں حضرات کی جدّوجہد نے دین کو محفوظ و مامون شکل میں ہم تک پہنچایا اور اُن کا یہ احسان قیامت تک اُمّت کے سر پر رہے گا۔ تمام محتاط اہلِ قلم نے صحابۂ کرامؓ کو اُن کے باہمی نزاعات میں مخلص تسلیم کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ حضرات اپنی اجتہادی رائیوں پر عامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا اختلاف ظنی مسائل میں ہوا ہے اور وہ ان مسائل میں اجتہاد کے مجاز تھے۔ اُن کی بلند کرداری، لِلّٰہیت، خلوص اور خدا پرستی کی سچّی زندگی اس پر شاہد ہے کہ صحابہؓ اپنی خواہشِ نفس کے پیرو نہیں تھے وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ہر جزئیہ میں صرف

"رضائے الٰہی" کو سامنے رکھتے تھے۔ یہی ان کا مطمح نظر تھا اور یہی اُن کا نصب العین۔

بہرحال کتاب کے جن بُنیادی مباحث پہ گفتگو کرنی ہے اُن کے تجزیہ سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے کچھ اقتباسات پیش کیے جائیں اور نتائج نکال کر گفتگو کی جائے، مصنف ص۴ پہ تحریر فرماتے ہیں۔

"ہم عصر حضرات کو جن میں کثیر تعداد صحابۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین کرام کی شامل تھی امیر یزید کی سیرت اور کردار میں کوئی خامی ایسی نظر نہیں آتی تھی جس کی بناء پر عقدِ بیعتِ خلافت ناجائز ٹھہرے یا بعد بیعت ان کے خلاف خروج و بغاوت کا جواز نکالا جائے۔"

ص۴۹ پر لکھا ہے۔

"علم و فضل، تقویٰ و پرہیز گاری، پابندی صوم و صلوٰۃ کے ساتھ امیر یزید حد درجہ کریم النفس، حلیم الطبع، سنجیدہ و متین تھے۔"

ص۶۰ پہ دیکھیے۔

سیرت امیر یزید کا یہ مختصر سا تذکرہ اس سلسلہ میں کیا گیا ہے کہ اُن کے کردار میں کوئی ایسی خامی نہیں تھی کہ اُن کے خلاف خروج کا جواز نکالا جا سکتا۔

ص۶۷ پہ تحریر ہے۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور احکام شریعت کی تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت حسینؓ کے امیر یزید کے خلاف اقدام خروج کا جواز مطلق نہ تھا۔"

مصنف نے یزید کے ایک شعر سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ حضرت حسینؓ نے بھی امیر المومنین معاویہؓ کی زندگی میں امیر یزید کی ولیعہدی کی بیعت کی تھی۔ ص۷۵

اور اپنے اس دعویٰ کی تائید میں ایک یورپین مورخ دوزی کے جملے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "آزاد اور بے لاگ مؤرخین نے حضرت حسینؓ کے اقدامِ خروج کے سلسلے میں اسی بات کو بیان کیا ہے۔ مشہور مؤرخ دوزی کا ایک فقرہ اس بارے میں قابلِ لحاظ ہے، وہ لکھتا ہے۔

"ایرانی شدید تعصّب نے اس تصویر میں خدوخال بھرے اور حضرت حسینؓ کو بجائے ایک معمولی قسمت آزما کے جو ایک انوکھی لغزش و خطائے ذہنی اور قریب قریب غیر معقول حُبِّ جاہ

کے کارن ہلاکت کی جانب تیز گامی سے رواں دواں ہوں، ولی اللہ کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں اکثر و بیشتر انھیں ایک دوسری نظر سے دیکھتے تھے، وہ انھیں عہد شکنی اور بغاوت کا قصوروار خیال کرتے تھے، اس لیے کہ انھوں نے حضرت معاویہؓ کی زندگی میں یزید کی ولیعہدی کی بیعت کی تھی اور اپنے حق یا دعوائے خلافت کو ثابت نہ کر سکے۔" ص ۷۶

اسی طرح ص ۹۷ پر "اقدامِ خروج کی غلطی" کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں "کردار خلیفہ میں کوئی خامی یا برائی ایسی نہ تھی کہ اس کے خلاف خروج کا جواز نکالا جا سکتا۔" ص ۹۷

پھر ص ۱۷۹ پر جو کچھ لکھتے ہیں اُسے غور سے پڑھا جائے۔

اب اگر بالفرض یہ ثابت کر دیا جائے کہ حضرت حسینؓ نے اپنے موقف سے رجوع نہیں کیا تھا تب بھی دینی زاویۂ نگاہ سے امیر المومنین پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا بلکہ اس سے پہلے جو واقعات گزر چکے ہیں اُن کی روشنی میں ایسا اعتراض بھی حکومت پر عائد نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ پر۔

حضرت علیؓ کی بیعت مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اُمّت کی بڑی اکثریت ان کی بیعت میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اُن کے خلاف جو حضرات کھڑے ہوئے وہ بڑی جمعیت رکھتے تھے ان کے قبضہ میں ملک تھے، اور لاکھوں انسانوں کی حمایت اُنھیں حاصل تھی۔ پھر ایسا خلیفہ جسے جمہور کی حمایت حاصل نہ ہو جب شرعاً اس کا مجاز ہے کہ اپنے مخالف کے خلاف تلوار اُٹھائے تو امیر یزید جو متفق علیہ خلیفہ تھے جن کا پرچم تمام عالم اسلام پہ لہراتا تھا جن کی بیعت میں سیکڑوں صحابۂ کرام خصوصاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ نیز حضرت حسینؓ کے بھائی حضرت محمد بن علیؓ (ابن الحنفیہ) جیسی مقتدر اور مقدس ہستیاں داخل تھیں وہ اس کے مجاز کیوں نہیں کہ اپنے خلاف خروج کرنے والوں کا مقابلہ کریں۔ ص ۱۷۹

حاصل یہی ہوا کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ جن کی بیعت مکمل نہیں ہوئی تھی، اُمّت کی بڑی اکثریت ان کے خلاف تھی اور جمہور اُمّت کی حمایت حاصل نہیں تھی" اگر حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے خلاف کارروائی کر سکتے ہیں تو شرعاً یزید کو جو متفق علیہ عادل خلیفہ تھا جس کی حکومت کا پرچم تمام عالمِ اسلامی پہ لہراتا تھا" اس کا حق کیوں نہیں کہ وہ حضرت حسینؓ پر تلوار اُٹھائے جو حکومتِ

عادلہ سے بغاوت کے مجرم تھے۔ آگے مصنّف نے خود واضح کیا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کی تلوار اگر اُم المومنین عائشہ رضؓ کے خلاف بے نیام ہوسکتی ہے۔۔۔ تو حضرت حسینؓ رضؓ کے خلاف تلوار کیوں نہیں اُٹھائی جاسکتی۔

اس کے بعد مصنّف نے حضرت حسین رضؓ کی دعوت اور تحریک کی بُنیاد کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے "جن کی (حضرت حسین رضؓ کی) دعوت محض یہ تھی کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نواسہ اور حضرت علی رضؓ کا فرزند ہونے کی حیثیت سے خلیفہ اُنہیں بنایا جائے۔

"اس طرح حضرت حسین بن علی رضؓ مصنف کے نقطۂ نظر سے محض خاندانی اور نسلی فضائل کی بنیاد پر یزید کے خلاف دعوتِ خلافت لے کر اُٹھے تھے اور ظاہر ہے کہ اسلام اس طرح کے دعاوی تسلیم کرنے کے لیے قطعًا تیار نہیں ہے۔ اسی لیے مصنف کے خیال میں حضرت حسین رضؓ ایک حکومتِ عادلہ اور خلافتِ صحیحہ کے باغی تھے، لیکن اس جرمِ بغاوت کے باوجود شروع سے ان کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں کی گئی خود لکھتے ہیں" باوجود اس کے ان کے خلاف شروع سے متشددانہ کارروائی نہیں کی گئی"۔ ص۱۸۰

ان اقتباسات اور کتاب میں پھیلے ہوئے دوسرے خیالات کی روشنی میں مصنف کے تصوّرات کا خلاصہ یہ ہے۔

الف: یزید علم و فضل، تقویٰ و پرہیزگاری کا جامع تھا۔ صوم و صلوٰة کی پابندی کے ساتھ حددرجہ کریم النفس، حلیم الطبع، سنجیدہ و متین تھا۔ خلافت کے لیے جن صفات کی ضرورت ہے وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

ب: ان سب باتوں کے بعد وہ خلیفہ منتخب ہوا۔

ج: صحابۂ کرام رضؓ اور جمہور اصحاب حل و عقد اُس کی خلافت پر متفق تھے اور کردار یزید میں کوئی ایسی خامی نہ پاتے تھے جس کی بُنیاد پر اس کے خلاف خروج کو جائز کیا جائے۔

د: ایسے عادل اور متفق علیہ خلیفہ کے خلاف خروج شرعًا حرام ہوگا اور اُسے خلافت عادلہ کے خلاف بغاوت کہا جائے گا۔

س: ان مقدمات کی روشنی میں ظاہر ہے کہ مصنّف کے نقطۂ نظر سے حضرت حسین رضؓ کا

اقدامِ خروج حرام ہوگا اور بغاوت، اور چونکہ حضرت حسین رضؓ نے ... حضرت معاویہؓ کی حیات میں یزید کی ولی عہدی کی بیعت بھی کر لی تھی۔ اس لیے وہ شرعاً غدر اور نقضِ عہد کے مجرم تھے۔

س: ان سب امور سے زیادہ اہم جرم اُن پر عائد ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی دعوت اور تحریک کی بُنیاد ہی ایک ایسی غلط بات پر رکھی جو قطعاً شریعتِ اسلامی کی رُوح کے خلاف ہے اسلام آیا ہی تھا نسلی اجارہ داری کو مٹانے اور اُسے جڑ سے اکھیڑنے پس حضرت حسین رضؓ کا مطالبہ خود مصنّف کے الفاظ میں ایسا تھا کہ "نہ کتاب اللہ سے اس کی سند پیش کی جا سکتی ہے، نہ سُنّت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے، نہ تعاملِ خلفائے راشدین اور نہ عزائم اہلِ بیت سے۔" (ص۱۵)

لیکن ان سب جرائم کے باوجود حکومتِ وقت نے "ان کے خلاف شروع سے متشددانہ کارروائی نہیں کی"، حضرت حسین رضؓ کربلا پہنچے اور اُن کی ملاقات اس فوجی دستہ سے ہوئی جو ہتھیار رکھوانے کی غرض سے ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ حضرت حسین رضؓ کے ساتھیوں نے جو سبائی ذہنیت رکھتے تھے۔ اس دستہ پر حملہ کر دیا اور اچانک جنگ چھڑ گئی اور یہ واقعۂ محزوں پیش آ گیا۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد راقم الحروف نے جو کچھ محسوس کیا وہ یہی اُمور ہیں اور مجھے اُمّید ہے کہ تمام اہلِ انصاف اس احساس میں شریک ہوں گے کتاب کے پیش کردہ مندرجہ بالا تصوّرات حق ہیں یا باطل؟ اس کے فیصلہ کی ایک راہ یہ ہے کہ ہم تاریخ کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ اس سلسلہ میں تاریخ کی تمام کتابیں واضح نظریات پیش کرتی ہیں، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا۔ مصنف کو عام کُتبِ تاریخ پر اعتماد نہیں ہے۔ ہاں اُن کو تمام کُتبِ تاریخ میں ابن خلدون پر اعتماد ہے جیسا کہ مصنف کی تصریح گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ ایک اور جگہ رقمطراز ہیں۔

"علّامہ موصوف نے ولایتِ عہد کی بحث میں امیر یزید کی ولی عہدی کے متعلّق جو کچھ بیان کیا ہے وہ اسی کتاب میں دوسری جگہ درج ہے۔ اس کے پیشِ نظر راقم الحروف کا یہ استنباط شاید غلط نہ ہو کہ تنہا وہی ایک مؤرّخ ہیں جنھوں نے دیگر وضعی روایات کی طرح سانحۂ کربلا کی موضوعات کو اسی معیار سے جانچنے کی کوشش کی تھی جس کی پاداش میں اُن کی کتاب کے تمام نسخوں سے صرف یہی تین ورق ... جو اس حادثہ کے بارے میں تھے ایسے غائب ہوئے کہ آج تک کسی فردِ بشر کو چار دانگِ عالم میں دستیاب نہ ہو سکے۔ (ص۸ عرضِ مؤلف)

مصنّف کا یہ استنباط کس حد تک صحیح ہے اس سے بحث نہیں۔ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مصنف کو ابن خلدون پر پورا بھروسہ ہے اس لیے ہم دوسری تاریخوں کا سہارا لینے کے بجائے خود "ابن خلدون" کی رائے مذکورہ بالا مسائل کے بارے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

**کیا یزید عادل، متقی اور پرہیزگار تھا**

علّامہ ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق مقدمۂ تاریخ میں (جو ان کی تاریخی معلومات اور تحقیقات کا نچوڑ ہے) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ تمام صحابہ شمع ہدایت تھے۔ اُن کی عدالت اُن کا تقوی اور اُن کا اخلاص محتاجِ بحث و نظر نہیں۔ وہ اس سے بہت بالاتر ہیں کہ ان کے بارے میں نفسانیت کا وہم بھی کیا جائے اس لیے حضرت امیر معاویہؓ کا یزید کو ولی عہد بنانا بھی دینی مصلحت سے تھا اور ان مباحث کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے۔

وَعَرَضَ هُنَا اُمُوْرٌ تَدْعُوا الضَّرُوْرَةُ اِلٰى بَيَانِ الْحَقِّ فِيْهَا (۱۷۶)

یہاں چند معاملات ایسے ہیں جن کے بارے میں حق کا واضح کر دینا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں پہلا سوال کیا ہے؟ اور ابن خلدون نے اسے کس طرح حل کیا ہے؟ ذرا غور سے سُنیئے، وہ کہتا ہے۔

فَالْاَوَّلُ مِنْهَا مَاحَدَثَ فِيْهِ يَزِيْدَ مِنَ الْفِسْقِ اَيَّامَ خِلَافَتِهٖ (۱۷۶)

پہلا مسئلہ تو یزید کے فسق کا ہے جو اس کے زمانہ خلافت میں پیدا ہو گیا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب یزید فاسق تھا تو حضرت معاویہؓ جیسے مخلص صحابی نے اسے ولی عہد کیوں بنایا؟ اس کا ضرور خیال رکھیے کہ ابن خلدون مَاحَدَثَ مِنَ الْفِسْقِ (یزید کے فسق) کا جزم و یقین کے ساتھ ذکر کرتا ہے مَايُرْوٰى (روایت کیا جاتا ہے) مَايُقَالُ (کہا جاتا ہے) مَايُنْسَبُ (فسق کی اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے) یا اس طرح کے دوسرے الفاظ استعمال نہ کیے جس سے یہ سمجھا جاتا کہ اُن کے نزدیک یہ روایات کمزور اور واہی ہیں۔

اور اگر فسقِ یزید کی روایتیں واہیات و مخترعات تھیں تو اُس کا صاف جواب یہی تھا کہ ابن خلدون ان روایتوں پر نقد کرتے۔ جیسا کہ اُن کی عادت ہے لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اُنھیں دوسرے جواب کا سہارا لینا پڑا۔ وہ لکھتے ہیں۔

فَاِيَّاكَ اَنْ تَظُنَّ بِمُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ عَلِمَ ذَالِكَ مِنْ يَزِيْدَ فَاِنَّهٗ اَعْدَلُ مِنْ ذٰلِكَ وَاَفْضَلُ۔ (۱۷۶)

ہرگز ہرگز تم حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہ گمان مت کرنا کہ وہ یزید کے اس فسق سے واقف تھے اور اُنھوں نے اس کو (پھر بھی ولی عہد بنادیا) وہ اس سے بالاتر اور بلند ہیں۔

یزید کو ابن خلدون عدالت و تقوٰی کے اعلیٰ مدارج پر سمجھتے ہیں یا فسق و فجور کا مرتکب۔ اسکا اندازہ تو مندرجہ بالا جملوں ہی سے ہو جاتا ہے لیکن اگلے جملہ میں تو ابن خلدون نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ یزید کی طرف جو موسیقی اور گانے بجانے کی شوق کی نسبت کی جاتی ہے وہ صحیح ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیات ہی میں پیدا ہو چکی تھی اور حضرت معاویہؓ اس کی حرکت پر ملامت بھی کرتے تھے۔

بَلْ كَانَ يَعْذِلُهٗ اَيَّامَ حَيَاتِهٖ فِيْ سِمَاعِ الْغِنَاءِ وَيَنْهَاهُ عَنْهُ (۱۷۶)

بلکہ حضرت معاویہؓ یزید کو اپنی زندگی میں غناء کے سُننے پر ملامت کرتے اور اس سے منع فرماتے تھے۔

ابھی تو مندرجہ بالا تصریح پر قناعت کیجیے۔ آئندہ صفحات میں اس مسئلہ کی کچھ اور تفصیل آرہی ہے۔

**صحابہؓ کا موقف یزید کے بارے میں**

مصنّف نے بہت تفصیل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صحابہؓ یزید کی امارت پر خاموش ہی نہیں رہے بلکہ اُنھوں نے اس کی خلافت کو بخوشی قبول کیا۔ مختلف عہدوں کو قبول کیا اس لیے کہ وہ یزید کو عادل و متقی خلافت کے لائق سمجھتے تھے۔ اُن کے خیال میں یزید کے کردار میں کوئی خامی نہیں تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

دیکھنا یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا موقف خلافتِ یزید اور کردارِ یزید کے بارے میں کیا تھا؟ کیا وہ واقعۃً اس کی عدالت و تقوٰی کے معترف تھے اور اسی لیے وہ حضرت حسینؓ کو اس اقدام سے روک رہے تھے۔ ابن خلدون یزید کے فسق اور اس کے بارے میں صحابۂ کرامؓ کا

مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"وَلَمَّا حَدَثَ فِیْ یَزِیْدَ مَا حَدَثَ مِنَ الْفِسْقِ اِخْتَلَفَتِ الصَّحَابَةُ حِیْنَئِذٍ فِیْ شَانِهٖ" (۱۷۷)

جب یزید میں فسق و فجور ظاہر ہوا تو اس وقت صحابہؓ کے مابین اس کے بارے میں اختلافِ رائے ہوا۔

خیال رکھیے کہ یزید کا فسق محتاجِ بحث مسئلہ نہ تھا۔ اختلاف ہوا تو اس میں کہ اس امام فاسق کے سلسلہ میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے؟

فَمِنْهُمْ مَنْ رَاَی الْخُرُوْجَ عَلَیْهِ وَنَقْضَ بَیْعَتِهٖ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَمَا فَعَلَ الْحُسَیْنُ رضی اللہ عنہ وَابْنُ الزُّبَیْرِ رضی اللہ عنہ وَمَنِ اتَّبَعَهُمَا فِیْ ذٰلِكَ (۱۷۷)

پس صحابہ کی ایک جماعت تو یزید کے خلاف خروج کرنے اور اس کے فسق و فجور کی وجہ سے بیعت توڑنے کی قائل تھی جیسا کہ حضرت حسینؓ اور ابن زبیرؓ نیز اُن کے متبعین نے کیا۔

اور دوسری جماعت کا مسلک یہ تھا۔

وَمِنْهُمْ مَنْ اَبَاهُ

اور صحابہ کی دوسری جماعت خروج کی منکر تھی۔

کیوں؟ کیا اس لیے کہ "یزید کے کردار میں کوئی خامی نہیں تھی"؟ نہیں! بلکہ

لِمَا فِیْهِ مِنْ اِثَارَةِ الْفِتْنَةِ وَكَثْرَةِ الْقَتْلِ مَعَ الْعَجْزِ عَنِ الْوَفَاءِ بِهٖ

اس لیے کہ اس سے فتنہ اُٹھے گا اور قتل و قتال ہوگا، پھر حالات بھی ایسے نہیں ہیں کہ یہ دعوت پوری ہوگی۔

اب ان صحابہ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ بھی سُنیئے۔

فَاقْصَرُوْا عَنْ یَزِیْدَ بِسَبَبِ ذٰلِكَ

اسی فتنہ و فساد کے خوف سے یزید کے خلاف خروج سے احتراز کیا،

اور

اَقَامُوْا عَلَی الدُّعَاءِ بِهِدَایَتِهٖ وَالرَّاحَةِ

اب وہ لوگ یزید کی ہدایت اور اُس سے مسلمانوں کی نجات کے لیے دُعا کرنے

مِنْہُ ۔ میں مشغول ہوگئے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک یزید کے بارے میں جو کچھ تھا، اس کا خلاصہ یہی ہوا کہ فاسق اسے سبھی سمجھتے تھے، بعضوں نے اس بلاء سے نجات دلانے کے لیے خروج کیا اور اپنی جانیں "حکومتِ عادلہ اور خلافتِ راشدہ" کے قیام کی جدوجہد میں قربان کردیں۔ دوسری جماعت نے عام مسلمانوں کو فتنہ وفساد سے بچانے کی خاطر سکوت اختیار کیا اور دُعا کی راہ اختیار کی، ابن خلدون نے اِس اختلافِ رائے کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت قیمتی جملے لکھے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وَالْكُلُّ مُجْتَهِدُوْنَ وَلَا يُنْكَرُ عَلٰى | یہ سب حضرات مجتہد تھے ان میں سے کسی |
| اَحَدٍ مِّنَ الْفَرِيْقَيْنِ فَمَقَاصِدُهُمْ | پر نکیر کرنا جائز نہیں۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ |
| فِي الْبِرِّ وَ تَحَرِّي الْحَقِّ | ان سب حضرات کا نصب العین صرف نیکی |
| مَعْرُوْفَةٌ۔ وَفَّقَنَا اللّٰهُ | اور حق ہوتا تھا۔ اللہ اُن کی اقتداء کی ہمیں |
| لِلْاِقْتِدَاءِ بِهِمْ (۱۷۷) | توفیق عطا فرمائے، آمین |

**حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیوں خروج کیا؟ اُن کی دعوت کیا تھی؟ کیا وہ محض نسلی فضیلت کی بُنیاد پر دعوٰی خلافت لے کر اُٹھے تھے**

جیسا کہ عرض کیا گیا۔ محمود احمد عبّاسی صاحب کے نُقطۂ نظر سے حضرت حسینؓ بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوت محض یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حضرت علیؓ کے بیٹے ہیں اس لیے اُنھیں خلیفہ بنایا جائے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مصنّف کا نقطہ نظر ایسا نہیں ہے جس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت پیش کی جائے، بلکہ تاریخ کا جائزہ ہماری رہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کا نصب العین "خلافتِ عادلہ صحیحہ" کا قیام تھا۔ یزید کا فسق خلافتِ نبوّت کو "خلافتِ قیصر وکسریٰ" سے بدل رہا تھا۔ یہ فسق گھر کی چار دیواریوں میں محدود نہ رہا تھا۔ بلکہ عوام الناس کے سامنے کھل چکا تھا، اس وقت حضرت امام حسین بن علیؓ کے اجتہاد نے اس طرف رہنمائی کی کہ اس "امام جائر" کے سامنے "حق کا اظہار" ضروری ہے اور اُنھوں نے اس راہ میں اپنی جان دے دی۔ ابن خلدون لکھتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاَمَّا الْحُسَيْنُ فَاِنَّهُ لَمَّا ظَهَرَ فِسْقُ | حضرت حسینؓ کا معاملہ یہ ہوا کہ جب یزید کا فسق |

يَزِيْدَ عِنْدَ الْكَافَّةِ مِنْ اَهْلِ عَصْرِهٖ بَعَثَتْ شِيْعَةُ اَهْلِ الْبَيْتِ بِالْكُوْفَةِ لِلْحُسَيْنِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ فَيَقُوْمُوْا بِاَمْرِهٖ (۱۸۰)

اس زمانہ کے تمام لوگوں کے سامنے کھل گیا تو کوفہ کے طرف داران اہلِ بیت نے انھیں پیغام بھیجا کہ وہ اُن کے پاس چلے آئیں، اور یہ لوگ اُن کی سرکردگی میں اُٹھ کھڑے ہوں۔

اَب یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک طرف خلیفہ کا فسق ہے جو تمام پبلک کے سامنے بے پردہ ہو چکا ہے۔ دوسری طرف اہلِ کوفہ کی دعوت ہے جو "تحریک" کے لیے شوکت کا سامان مہیّا کرتی ہے حضرت امام حسین رضؓ نے اپنے کو اس دعوت کا اہل سمجھا اور خروج کا فیصلہ کیا اور اہلِ کوفہ کے اس پیغام کو لبّیک کہا۔ اب آپ غور کریں کہ کیا حضرت حسینؓ نے اُس پکار پر لبّیک محض اس لیے کہا کہ وہ جاہ و اقتدار کے بھوکے تھے؟ یا محض اس لیے کہ وہ نبی کے نواسے تھے؟ ابن خلدون لکھتا ہے۔

فَرَأَى الْحُسَيْنُ اَنَّ الْخُرُوْجَ عَلٰى يَزِيْدَ مُتَعَيِّنٌ مِّنْ اَجْلِ فِسْقِهٖ لَاسِيَّمَا مَنْ لَّهُ الْقُدْرَةُ عَلٰى ذٰلِكَ (۱۸۰)

حضرت حسین رضؓ نے رائے قائم کی کہ یزید کے فسق وفجور کی وجہ سے اَب اس کے خلاف خروج ضروری ہے۔ خصوصًا اس شخص پر جو اُس کی قدرت رکھتا ہو۔

معلوم ہُوا کہ حضرت حسین رضؓ کے اقدامِ خروج کی وجہ یزید کی نا اہلی تھی، اُن کا اپنا "نسلی استحقاق" نہیں۔[1] آگے چل کر ابن خلدون لکھتا ہے کہ

---

[1] علامہ ابن اثیر (متوفی ۶۳۰ھ) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سبب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

وسبب قتله انه لما مات معاوية بن ابى سفيان كاتب كثير من اهل الكوفة الحسين بن على ليأتى اليهم ليبايعون وكان قد امتنع من البيعة

اُن کی شہادت کا سبب یہ ہوا کہ جب حضرت معاویہ رضؓ بن ابی سفیان رضؓ کی وفات ہُوئی تو بہت سے کوفہ والوں نے حضرت حسین رضؓ بن علی رضؓ کو خط لکھ لکھ کے ان سے بیعت کرنے کے لیے اُنھیں بُلایا اور وہ یزید بن معاویہ کی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

حضرت حسینؓ نے اپنے اندر خروج کی قدرت محسوس کی اپنی اہلیت اور اپنی شوکت کی وجہ سے

ابن خلدون لکھتا ہے کہ جہاں تک خلافت کی اہلیت اور صلاحیت کا تعلق ہے۔

حاشیہ صفحہ گزشتہ

ليزيد بن معاوية لما بايع
له ابوه بولاية العهد وامتنع
معه ابن عمر وعبد الله بن
الزبير وعبد الرحمٰن بن ابی بكر
فلمّا توفی معاوية لم يبايع
ايضا وسار من المدينة
الى مكة فاتاه كُتُبُ اهلِ الكوفة
وهو بمكة فتجهز للمسير فنهاه
جماعة منهم اخوه محمد ابن الحنفية
وابن عمر وابن عبّاس وغيرهم
فقال رأيت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم
فی المنام وامرنی بامرٍ فانا فاعلُ ما
امر فلما اتی العراق كان يزيد
قد استعمل عبيد الله بن زياد على
الكوفة فجهز الجيوش اليه واستعمل
عليهم عمر بن سعد بن ابی
وقاص ووعدهٗ امارة
الری فسار اميرًا على الجيش و
قاتلوا حسينا بعد ان طلبوا منه ان
ينزل على حكم عبيد الله بن زياد

بیعت سے انکار کر چکے تھے، جبکہ حضرت معاویہؓ نے
اس کی ولی عہدی کی بیعت لوگوں سے لی تھی، حضرت
حسینؓ کے ساتھ ابن عمرؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ اور
عبد الرحمٰن ابن ابی بکرؓ بھی بیعت سے رُکے ہوئے تھے،
جب حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی تب بھی حضرت
حسینؓ نے بیعت نہ کی اور مدینہ (منورہ) سے مکہ
(مکرمہ) چلے گئے، مکہ ہی میں اہلِ کوفہ کے خطوط اُن
کے پاس پہنچے، لہٰذا اُنھوں نے سفر کا سامان تیار
کرلیا، بہت سے لوگوں نے اُنھیں منع کیا ان منع کرنے والوں
میں اُنکے بھائی محمد بن حنفیہؓ اور ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ
وغیرہ تھے، مگر حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ
علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے آپ نے مجھے جس بات کا حکم دیا
ہے اُسکو میں ضرور کروں گا، چنانچہ وہ عراق چلے گئے یزید نے
(صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت نعمان بن بشیرؓ کو ہٹا کر)
عبید اللہ بن زیاد کو (جو آپکا دشمن تھا) کوفہ کا حاکم بنایا
تھا اس نے حضرت حسینؓ کی طرف لشکر بھیجے اور عمر بن سعد بن
ابی وقاص کو سردارِ لشکر بنایا اور (درصورتِ فتح یابی) اُسے
رَے کی حکومت کا اُمیدوار کیا، چنانچہ وہ لشکر لے
کے گیا اور حضرت حسینؓ سے جنگ کی بعد اس کے
کہ اُن سے اس بات کی درخواست کی کہ عبید اللہ بن زیاد

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

فَكَانَتْ كَمَا ظَنَّ وَزِيَادَةً — اہلیت جیسی وہ سمجھتے تھے ویسی ہی تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ

ہاں شوکت کے انداز میں اُن سے غلطی ہُوئی اس لیے کہ اس وقت ساری کلیدی طاقتیں، اور عصبیت بنوامیہ کے ہاتھ میں تھی۔ زمانۂ جاہلیّت کی عصبیت جو اہم مسائل کے پیش آجانے کی وجہ سے دَب گئی تھی، پھر اُبھر آئی تھی اس لیے اس کا مقابلہ مشکل تھا۔ اس تفصیل کے بعد لکھتا ہے کہ

قَدْ تَبَيَّنَ لَكَ غَلَطُ الْحُسَيْنِ إِلَّا أَنَّهُ فِي أَمْرٍ دُنْيَوِيٍّ وَلَا يَضُرُّهُ — حضرت حسین رضؓ کے اندازہ کی غلطی تمہارے سامنے واضح ہوگئی لیکن خیال رکھو کہ یہ غلطی دُنیاوی امر میں ہُوئی اور دُنیاوی (سیاسی) غلطی

---

حاشیہ صفحہ گزشتہ

فامتنع و قاتل حتی قتل هو و تسعة عشر من اهل بيته" الخ (اسد الغابة فی معرفة الصحابة ج ۲ ص ۲۰) — کے حکم سے اُتر آئیں اور اُنھوں نے اُس کو منظور نہ کیا اور جنگ کو اختیار فرمایا یہاں تک کہ خود شہید ہُوئے اور اُنیس ۱۹ آدمی اُن کے گھر کے شہید ہُوئے۔

علامہ ابن الاثیر رحمہ اللہ کے بیان سے درج ذیل اُمور ثابت ہُوئے۔

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں یزید کی ولی عہدی کی جو بیعت لی تھی اُس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے انکار کیا تھا اور بیعت نہیں کی تھی اور تنہا آپ نے ہی نہیں بلکہ آپ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم نے بھی انکار کیا تھا۔ اس روایت کی موجودگی میں سیّدنا حسین رضؓ کو نقضِ عہد کا مجرم گردانا انتہائی ناانصافی ہے۔ کیونکہ جب اُنھوں نے عہد کیا ہی نہیں تو نقضِ عہد کا کیا مطلب۔

② حضراتِ صحابہ کرام نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کے خلاف خروج سے شفقۃً ضرور روکا تھا لیکن اُن کے خروج کو ناجائز نہیں کہا۔

③ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے روکنے کے باوجود جو خروج کیا اس کی وجہ اُنھوں نے بتلا دی کہ وہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی طرف سے مامور ہیں۔ چنانچہ فرمایا "میں نے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خواب میں دیکھا ہے، آپ نے مجھے جس بات کا حکم دیا ہے وہ میں ضرور کروں گا" اس کے باوجود بھی سیّدنا حسین رضؓ کے یزید کے خلاف خروج کو بغاوت قرار دینا اور آپ کے اس اقدام کو نسلی استحقاق اور ہوسِ اقتدار کی جنگ بتلانا اور

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الْغَلَطُ فِيْهِ۔ (۱۸۱) سے اُنھیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

رہا اس خروج کا شرعی حکم تو ظاہر ہے کہ اس کے جواز میں شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ اس کی بُنیاد مجتہد کے اجتہاد پر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت امام کے خروج کی بُنیاد یزید کا فِسق و فجور تھا۔ اُن کی تحریک کی بُنیاد "خلافتِ عادلہ" کا قیام تھا۔ وہ خدانخواستہ ایک غیر اسلامی چیز یعنی نسلی فضیلت کی بُنیاد پر خلافت کے مُدّعی نہ تھے۔

**صحابہؓ کا موقف حضرت حسینؓ کے بارے میں** جب عام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ مسلک سامنے آگیا کہ وہ یزید کے فِسق کے باوجود اُس کے خلاف خروج کے قائل نہ تھے۔ محض اس لیے کہ فتنہ و فساد کا خطرہ تھا۔ عام صحابہ اپنے اس اجتہاد کی بُنیاد پر حضرت امامؓ کا ساتھ تو نہ دے سکے۔

لَمْ يُتَابِعُوا الْحُسَيْنَ اُنھوں نے حضرت حسینؓ کی اتباع نہ کی

لیکن امام حسینؓ کو غیر اسلامی تحریک کا داعی اور گنہگار بھی نہ کہا۔

وَلَا اَنْكَرُوْا عَلَيْهِ وَلَا اَثَّمُوْهُ نہ انھوں نے حضرت حسینؓ پر نکیر کی اور نہ اُنھیں گنہگار قرار دیا۔ (۱۸۱)

اور عام صحابہؓ کو حضرت حسینؓ نے بھی مورد الزام قرار نہیں دیا۔ اس لیے کہ وہ بھی اپنے اجتہاد پر عامل تھے۔ لیکن اپنی دعوت کی حقانیت پر اور اپنی تحریک کی سچائی پر اُنھیں صحابہ کو گواہ

---

حاشیہ صفحہ گزشتہ

ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

④ جب سیّدنا حسینؓ عراق پہنچے تو یزید نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو (جو جلیل القدر صحابی تھے) ہٹا کر حضرت حسینؓ اور آپ کے خاندان کے دُشمن ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا، اس نے عمر بن سعد کو حضرت حسینؓ سے قتال کے لیے یہ وعدہ کر کے بھیجا کہ اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمہیں رَیّ کا امیر بنا دوں گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیّدنا حسینؓ کی شہادت کا سانحہ کوئی اتّفاقی امر نہ تھا۔ جیسا کہ خارجی کہتے ہیں بلکہ یہ واقعہ باقاعدہ پُورے منصوبہ کے تحت پیش آیا ہے۔ (نعیم الدّین)

بناتے تھے، جو عملاً اُن کے اس اقدام میں شریک نہیں تھے اور کربلا میں اعلان کرتے تھے۔

يَسْتَشْهِدُ بِهِمْ وَهُوَ يُقَاتِلُ بِكَرْبَلَاءَ عَلٰى فَضْلِهٖ وَحَقِّهٖ وَيَقُوْلُ سَلُوْا جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ وَاَبَا سَعِيْدِ الْخُدْرِيَّ وَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ وَسَهْلَ بْنَ سَعِيْدٍ وَّ زَيْدَ بْنَ اَرْقَمَ وَاَمْثَالَهُمْ۔ (۱۸۱)

حسینؓ جب کربلا میں قتال کر رہے تھے اُنھیں صحابہؓ کو اپنے فضل اور اپنے حق پر گواہ بناتے تھے اور کہتے تھے۔ پوچھو! جابر بن عبداللہؓ، ابوسعید خدریؓ، انس بن مالکؓ، سہل بن سعیدؓ اور زید بن ارقمؓ وغیرہ سے۔

خلاصہ یہی ہوا کہ حضرت حسین بن علیؓ اپنے اجتہاد پر عمل پیرا ہو کر یزیدیوں سے نبرد آزما ہوئے اور عام صحابہؓ نے فتنہ و فساد کا خیال کرتے ہوئے اسی میں نجات سمجھی کہ یزید کی ہدایت کے لیے دُعا کی جائے اور اس سے نجات اور راحت کی دُعا کی جائے۔ حضرت حسینؓ سمجھ رہے تھے کہ عام صحابہ بھی یزید کے فسق سے واقف ہیں اور وہ بھی خلافتِ عادلہ کے قیام کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن بنوامیہ کی طاقت اور عصبیت کی بناء پر کسی نئی تحریک کا بار آور ہونا مشکل ہے اور پھر مسلمانوں کے مابین قتل و خون کا اندیشہ ہے، اس لیے وہ اس طرح کی تحریک اُٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے حضرت حسینؓ نے اُنھیں مدد نہ کرنے پر موردِ الزام بھی نہ سمجھا اور دوسری طرف اُنھیں اپنی دعوت پر گواہ بناتے رہے۔ یہیں سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ بعض صحابہؓ نے حضرت حسینؓ کو اس اقدام یا کوفہ کی طرف جانے سے روکا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ "یزید کے کردار میں کوئی ایسی خامی نہ تھی جس کی وجہ سے اس کے خلاف خروج جائز نہ ہو" بلکہ اس کی وجہ یہی تھی کہ صحابہؓ سمجھ رہے تھے کہ حالات ایسے نہیں ہیں جس میں یہ تحریک کامیاب ہو سکے۔

**کیا یزید اور دوسروں کیلئے حضرت حسینؓ سے قتال جائز تھا؟**

اس شُبہہ کا ازالہ کرتے ہوئے کہ کیا حضرت حسینؓ کے قتل میں صحابہؓ کی رائے کو بھی دخل تھا؟ ابن خلدون لکھتا ہے۔

حضرت حسینؓ سے یزیدیوں کا قتال حضرات صحابہؓ کی رائے اور اُنکے اجتہاد سے نہ تھا۔ (ص ۱۸۱) بلکہ

اِنَّمَا انْفَرَدَ بِقِتَالِہٖ یَزِیْدُ وَ اَصْحَابُہٗ (۱۸۱) بلکہ اُن کے قتال کے ذمّہ دار صرف یزید اور اس کے ساتھی ہیں۔

اس کے بعد اس طرح کے خیالات کی تردید کرتا ہے "کہ جب حضرت حسینؓ باغی تھے تو اُن سے قتال شرعًا جائز ہونا چاہیے" اور لکھتا ہے کہ

"باغیوں سے قتال عُلماء کے نزدیک اسی وقت جائز ہے جبکہ آپ امام عادل کا ساتھ دے رہے ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے۔"

اس لیے کہ یزید ظاہر ہے کہ عادل نہیں تھا پس اس کے خلاف خروج "امام عادل" کے خلاف بغاوت نہ ہوگی۔" لہٰذا شرعًا حضرت حسینؓ سے قتال جائز نہیں ہوگا۔

فَلَا یَجُوْزُ قِتَالُ الْحُسَیْنِ مَعَ یَزِیْدَ وَلَا لِیَزِیْدَ لہٰذا حضرت حسینؓ سے قتال کرنا نہ (دوسروں کیلئے) یزید کی معیت میں جائز تھا اور نہ خود یزید کے لیے جائز تھا۔

اور اگلا جملہ سُنیے

بَلْ ھِیَ مِنْ فِعْلَاتِہِ الْمُؤَکِّدَۃِ لِفِسْقِہٖ (۱۸۱) بلکہ حضرت حسینؓ سے قتل و قتال تو یزید کی ان حرکتوں میں سے ایک حرکت ہے جو اُس کے فسق کو اور پختہ کر دیتی ہے۔

حضرت حسینؓ کی حیثیت اس معاملہ میں کیا تھی؟

وَالْحُسَیْنُ فِیْھَا شَھِیْدٌ مُثَابٌ وَھُوَ عَلٰی حَقٍّ وَّ اجْتِھَادٍ حسینؓ شہید تھے، اللہ کی طرف سے اجر و ثواب کے مستحق ہوئے، وہ برحق تھے اور اپنے اجتہاد پر عامل

**ابن العربی اور واقعۂ شہادت** قاضی ابوبکر بن العربی نے "العواصم من القواصم" نامی کتاب میں حضرت حسینؓ بن علیؓ کے قتل کو حق بجانب قرار دیا ہے، اور اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ محمود احمد صاحب عبّاسی نے ابن عربی کی رائے سے بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے، لیکن ابن خلدون نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

قَدْ غَلَطَ الْقَاضِی اَبُوْبَکْرِ ابْنُ الْعَرَبِیُّ الْمَالِکِیُّ فِیْ هٰذَا فَقَالَ فِیْ کِتَابِهِ الَّذِیْ سَمَّاهُ الْعَوَاصِمَ مِنَ الْقَوَاصِمِ مَا مَعْنَاهُ اَنَّ الْحُسَیْنَ قُتِلَ بِشَرْعِ جَدِّهٖ (۱۸۱)

قاضی ابوبکر بن العربی سے اس مسئلہ میں غلطی ہوگئی اُنھوں نے اپنی کتاب "العواصم من القواصم" میں ایسے الفاظ لکھے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت حسینؓ اپنی نانا کی شریعت کے مطابق قتل کیے گئے۔

ابن عربی کا اشارہ اسی طرف ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے باغی کی سزا قتل ہے اس لیے حضرت حسینؓ کا قتل جائز تھا۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ ابن عربی کا یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ باغی کا قتل جائز اس وقت ہے جب کہ امام عادل ہو۔ یہاں تو مسئلہ کی صورت ہی دوسری ہے۔ ایک طرف یزید ہے، جس کا فسق و فجور روزِ روشن کی طرح واضح ہوچکا تھا یہ "اہلِ آراء" جو اپنی شہوات اور خواہشِ نفس کے مطابق حکومت چلا رہے تھے، دوسری طرف حسینؓ تھے جو مجسمۂ عدالت و تقویٰ اور سراپا شرافت و دیانت تھے پس حضرت حسینؓ کے اقدامِ خروج کی حیثیت امام عادل کے خلاف بغاوت کی نہیں بلکہ امام جائر و فاسق کے مقابلہ میں "حق و صداقت کے علمبرداروں" کے خروج کی ہے، یہ حکومتِ عادلہ کے خلاف بغاوت نہیں تھی بلکہ امام جائر کے سامنے کلمۂ حق کا اظہار تھا اور قتل کا قانون اس بغاوت و عہد شکنی کے لیے ہے۔ جو امامِ عادل کے مقابلہ میں اختیار کی جاتی ہے، نہ کہ اُس شخص کے لیے جو کھڑا ہُوا ہو۔ "ہر قلیت و کسرویت" جاہلی عصبیت اور فسق و فجور کو مٹا کر حق و عدالت کی بُنیاد پر حکومت قائم کرنے کے لیے پس ایسے شخص کے قتل کو کیسے جائز کہا جا سکتا ہے؟ ابن خلدون لکھتا ہے۔

وَهُوَ غَلَطٌ حَمَلَتْهُ عَلَیْهِ الْغَفْلَةُ عَنِ اشْتِرَاطِ الْاِمَامِ الْعَادِلِ وَمَنْ اَعْدَلُ مِنَ الْحُسَیْنِ فِیْ زَمَانِهٖ فِیْ اِمَامَتِهٖ وَعَدَالَتِهٖ فِیْ قِتَالِ اَهْلِ الْاٰرَاءِ (۱۸۱)

ابی عربی کی یہ رائے غلط ہے اُنھوں نے یہ غلط رائے اس لیے قائم کی کہ وہ "امام عادل کی شرط" سے غافل ہو گئے اور حضرت حسینؓ سے بڑھ کر اُن کے زمانہ میں امامت اور عدالت کے اعتبار سے اہل آراء کے قتال کے لیے کون اعدل تھا۔

## حاصلِ کلام

ابن خلدون کی اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

① یزید فاسق و فاجر تھا۔ اُس کا فسق و فجور عوام و خواص پہ ظاہر ہو چکا تھا۔

② تمام صحابہؓ کو اس کی ان خامیوں کا احساس تھا، لیکن عام صحابہؓ فتنہ و فساد کے خوف سے خروج کے قائل نہیں تھے اور بعض حضرات اس کے فسق کی وجہ سے خروج کو ضروری سمجھتے تھے۔

③ حضرت حسینؓ نے اس وقت خروج کیا جب یزید کا فسق کھل کر سامنے آگیا۔

④ حضرت حسینؓ پر صحابہؓ نکیر نہیں کرتے تھے اور نہ گنہگار سمجھتے تھے۔

⑤ حضرت حسینؓ سے قتال کو شرعاً جائز نہیں کہا جاسکتا۔

⑥ اس قتال کی ذمہ داری یزید اور اُس کے ساتھیوں پر آتی ہے۔

⑦ حضرت حسینؓ برحق تھے، وہ واقعہ کربلا میں شہید ہوئے۔

⑧ حضرت حسینؓ کی حیثیت باغی کی نہیں تھی بلکہ وہ "غلط بُنیادوں پہ قائم حکومت" کو مٹا کر

⑨ "جائز اسلامی خلافت اور حکومتِ عادلہ" قائم کرنا چاہتے تھے۔

اب ان حقائق کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیجیے کہ مصنّف کے پیش کردہ تصوّرات کس حد تک صحیح ہیں؟

❁*❁

بقیہ: فضیلت کی راتیں

برکات سے محروم رہنے کے ساتھ ساتھ گناہوں کا بوجھ بھی سروں پہ لادتے ہیں خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃ یہ بڑے ہی نقصان اور گھاٹے کا سودا ہے۔ مرنے کے بعد احساس ہوگا۔ وہاں پتہ چلے گا کہ کرنا کیا تھا اور کر کیا آئے؟ اللہ تعالیٰ سمجھ اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

❁❁❁

پاکستان کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا

قرشی

# جوھر جوشاندہ

غلو، نزلہ، زکام اور گلے کی خراش کا مؤثر علاج

صدیوں سے آزمودہ جوشاندہ
اب فوری حل ہونے والے انسٹنٹ
جوھر جوشاندہ کی شکل میں۔
ترکیبِ استعمال: ایک کپ گرم
پانی یا چائے میں ایک پیکٹ
جوھر جوشاندہ ملائیں
اور جوشاندہ تیار۔
دن میں دو یا تین پیکٹ
جوھر جوشاندہ
استعمال کریں۔

آسان استعمال
مؤثر علاج

قرشی
تحقیق کی روایت
معیار کی ضمانت

# جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد بیع وشراء وغیرہ ممنوع کاموں کے ارتکاب سے لوگوں کو بچانے کے لیے کیا اذانِ اوّل کو مؤخر کرنا جائز ہے؟

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد

**سوال:** جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد خرید وفروخت اور نماز کے منافی ہر کام کو چھوڑ کر مسجد میں آنا واجب ہے لیکن چونکہ لوگوں میں اس کا اہتمام بہت کم ہے کہ اذان اوّل کے وقت مسجد میں آجائیں اس لیے ترکِ واجب کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لوگ اس معصیت سے بچ جائیں اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ اذان اوّل کو تاخیر سے کہا جائے اور دونوں اذانوں کے مابین فقط اتنا وقفہ کیا جائے کہ لوگ سُنّتیں پڑھ لیں تو کیا ایسا کرنا جائز ہے۔ مثلاً دوسری اذان سوا ایک بجے ہو اور پہلی اذان ایک بجے یا ایک بج کر پانچ منٹ پر کہی جائے جبکہ زوال کا وقت سوا بارہ بجے ہو۔ اُردو میں تقریر اذان اوّل سے پہلے ہی ہو جاتے اس طرح بہت زیادہ لوگ اذانِ اوّل کے وقت مسجد میں موجود ہوں گے۔ بعض مساجد میں اس طریقے پر عمل ہو رہا ہے۔

الجواب باسم ملهم الصواب حامدا ومصليا۔

جمعہ کی اذان اوّل کا وقت زوال کے متصل بعد ہے۔ اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے۔ کتبِ حدیثیہ و فقہیہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔

① المغنی (لابن قدامہ) میں ہے۔

ويبدأ وجوب السعي اليها... عند الحنفية بالاذان الاوّل عند الزوال

(بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج: ۲، ص: ۲۶۲)

(ترجمہ: حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لیے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذان اوّل سے شروع ہوتا ہے۔)

② معارف السنن میں مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

وبالجملة فهذا الاذان كان قبل التاذين بين يدى الخطيب وكان فى اوّل وقت

الظهر متصلا بالزوال۔ (ج ۴، ص ۳۹۶)

(ترجمہ: اذان اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر ہوتی تھی۔ اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔

③ مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر میں ہے۔

ویجب السعی وترك البیع بالاذان الاوّل عقیب الزوال (ص: ۱۷۱، ج: ۱)

(ترجمہ) جمعہ کے لیے سعی اور ترک بیع زوال کے بعد اذان اوّل سے واجب ہوتی ہے۔

④ عمدۃ القاری میں علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

"قوله زاد النداء الثالث" انما سمی ثالثا باعتبار کونه مزیدًا الان الاول هو الاذان عند جلوس الامام علی المنبر والثانی هو الاقامة للصلاة عند نزوله والثالث عند دخول وقت الظهر۔ (ص: ۲۱۱، ج: ۶)

(ترجمہ: پہلی اذان کو جو تیسری اذان کہا گیا تو اس اعتبار سے کہ اس کو زیادہ کیا گیا تھا کیونکہ پہلی اذان وہ ہے جو امام کے سامنے ہوتی ہے جب وہ منبر پر بیٹھا ہوتا ہے اور دوسری سے مراد نماز کے لیے اقامت ہے جو امام کے منبر سے اُترنے پر ہوتی ہے اور تیسری اذان وہ ہے جو ظہر کا وقت شروع ہونے پر ہوتی ہے)

⑤ فتح الباری میں علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

وتبین بما مضیٰ ان عثمان احدثه لاعلام الناس بدخول وقت الصلاة..... الخ

(ص: ۳۹۴، ج: ۲)

(ترجمہ: سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلی اذان اس لیے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہو جائے)

⑥ تبیین الحقائق میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

وقال بعض العلماء یجب السعی وترك البیع بدخول الوقت لان التوجه إلی الجمعة یجب بدخول الوقت وان لم یؤذن لها أحد ولهذا لا یعتبر الاذان قبل الوقت۔ (ص: ۲۲۳، ج: ۱)

(ترجمہ: بعض علماء نے کہا ہے کہ سعی اور ترک بیع کا وجوب جمعہ کا وقت شروع ہونے سے ہوتا

ہے کیونکہ جمعہ کی طرف توجہ کا وجوب وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی نے بھی اس کے لیے اذن نہ کہی ہو۔ اسی لیے وقت سے پیشتر اذان کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔)

⑦ تفسیراتِ احمدیہ میں حضرت ملا جیون رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

وقال الامام الزاهد المراد بالنداء دخول الوقت اذ به يحرم البيع دون الاذان نفسه۔ (ص: ۴۷۵)

(ترجمہ: امام زاہد نے کہا کہ نداء سے مراد وقت کا شروع ہونا ہے کہ اس سے بیع حرام ہوتی ہے اور عین اذان مراد نہیں ہے۔)

⑧ احکام القرآن میں مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قوله تعالىٰ وذروا البيع اختلف السلف فی وقت النهی عن البيع فروی عن مسروق والضحاك ومسلم بن يسار ان البيع يحرم بزوال الشمس۔ وقال مجاهد والزهری يحرم بالنداء۔ وقد قيل ان اعتبار الوقت فی ذلك اولى اذا كان عليهم الحضور عند دخول الوقت فلا يسقط ذلك عنهم تاخير النداء۔ ولما يكن للنداء قبل الزوال معنى دل ذلك على ان النداء بعد الزوال انما هو بعد ما قد وجب اتيان الصلاة۔

(ص: ۶۳، ج: ۵)

(ترجمہ: ارشاد باری تعالیٰ وذروا البیع، بیع سے ممانعت کے وقت کے بارے میں سلف میں اختلاف ہوا ہے۔ مسروق ضحاک اور مسلم بن یسار رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ زوالِ آفتاب سے ہی بیع حرام ہوجاتی ہے۔ مجاہد اور زہری رحمہما اللہ کا قول ہے کہ اذان سے حرام ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بارے میں وقت کا اعتبار کرنا اولیٰ ہے کیونکہ وقت شروع ہونے پر لوگوں کے ذمے جمعہ کے لیے حاضری واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا اذان کو مؤخر کرنا ان سے اس واجب کو ساقط نہیں کریگا الخ) مذکورہ بالا حوالجات سے دو باتیں سامنے آئیں۔

(الف) جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال سے متصل بعد کا ہے۔

(ب) بعض علماء کے نزدیک بیع وشراء وغیرہ کی حرمت کا تعلق وقتِ زوال سے ہے تنہا اذان سے نہیں۔ اگر زوال کے وقت ہی اذان ہو تب تو وقت اور اذان دونوں کے ساتھ حکمِ ممانعت کا

تعلق ہوا اور اگر اذان اوّل کو تاخیر سے کہا گیا تو حکمِ ممانعت کا تعلق وقت زوال کے ساتھ ثابت ہوگا اذان کہے جانے تک مؤخر نہیں ہوگا۔

ان دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ سمجھنا دشوار نہیں ہوگا کہ اصلاحِ احوال کے لیے جس صورت کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے وہ انتہائی غیر مناسب ہے کہ اس میں ترکِ واجب کے ارتکاب سے بچاؤ تو کیا ہوتا الٹا عملی توارث اور ایک حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہے یعنی اذانِ اوّل کی اس کے اصل وقت سے تاخیر۔

جن مساجد میں اذانِ اوّل کو مؤخر کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے ضروری ہے کہ وہاں اس طریقے کو ختم کر دیا جائے۔

اصلاح احوال کی متبادل صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اذان اوّل کو اپنے وقت پر رکھتے ہوئے اذانِ ثانی کو جہاں تک ہو سکے مقدم کر لیا جائے لیکن اس میں بھی اتنا وقفہ ضرور رکھا جائے کہ لوگ اذانِ اوّل کو سن کر مسجد میں جمع ہو جائیں اور فرضوں سے پہلے کی سنتیں پڑھ سکیں کیونکہ ایک روایت میں ہے۔

فاحدث عثمان التاذینة الثالثة علی الزوراء لیجتمع الناس۔

(عمدۃ القاری، ص: ۲۱۱، ج: ۶)

(حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زوراء پر تیسری اذان شروع کرائی تاکہ لوگ اکٹھے ہو جائیں۔)

اور ایک اور روایت میں ہے فاذن بالزوراء قبل خروجه لیعلم الناس ان الجمعة قد حضرت (فتح الباری، ص: ۳۹۴، ج: ۲)

(اپنے نکلنے سے پیشتر زوراء پر اذان دلوائی تاکہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ جمعہ کا وقت ہو گیا ہے)

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہماری رائے میں یہ وقفہ آدھ گھنٹہ کا تو ضرور ہونا چاہیے یعنی اذانِ اوّل تو زوال ہوتے ہی کہہ دی جائے اور آدھ گھنٹے بعد اذانِ ثانی کہہ دی جائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
عبد الحمید غفرلہٗ
مفتی و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

الجواب صحیح
محمد قاسم
اُستاذ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

# "اصلاحِ مفاہیم"
# کے مترجم مولوی انیس احمد کا اعتراف

مولوی انیس احمد صاحب مفتی عبدالستار صاحب دامت برکاتہم کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

بخدمت اقدس مخدومی ومکرمی ومحترمی حضرت اقدس مفتی صاحب زید مجدہٗ سلام مسنون!

گرامی نامہ کئی ہفتہ قبل مل گیا تھا۔ طبیعت پر تقاضا اس درجہ تک ہوا کہ خود قدم بوسی کے لیے حاضر ہوکر جن غلطیوں کی طرف نشاندہی کی ہے تسلیم کروں اور صورتحال بھی عرض کروں، مگر والد صاحب زید مجدہٗ نے سفر سے روک دیا کہ گھر میں بھی علالت کا سلسلہ چل رہا ہے پھر بچوں کی اور مدرسہ کی تعلیم کا بھی حرج تھا۔ (ہوا یہ کہ) سیدی حضرت اقدس صوفی صاحب مدظلہ العالی نے "اصلاحِ مفاہیم" کا مسوّدہ ٹیکسلا طلب فرمایا تو میں نے والد صاحب زید مجدہٗ کے ذریعہ یہ مسوّدہ ٹیکسلا روانہ کر دیا اس میں ناکارہ کی پہلی غلطی کہ نظرثانی کے بغیر ہی مسوّدہ بھیج دیا۔ دوسری غلطی یہ کہ کتابت، تصحیح اور طباعت کے وقت بندہ کو وہاں موجود رہنا چاہیے تھا، مگر اس دوران بندہ مطلق گیا ہی نہیں۔

① چنانچہ نظرثانی وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طباعت میں متعدد خامیاں رہ گئیں۔

② حواشی تمام کے تمام رہ گئے۔

③ تقریظ حضرت مخدوم ومعظم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ظلہم رہ گئی، حالانکہ والد صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت اقدس صوفی صاحب مدظلہ العالی نے بار بار فرمایا کہ یہی تقریظ اصل ہے جو اکابر کے مسلک اور ہمارے موقف کو واضح کرتی ہے۔ (خدا جانے کہ کیسے ہی رہ گئی۔)

④ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب مظاہری مدنی دامت برکاتہم کا مقدمہ بھی رہ گیا۔

⑤ مزے کی بات یہ ہے کہ ہم نے نام "قابلِ اصلاح مفاہیم" تجویز کیا تھا۔ خدا جانے لفظ "قابل" کیسے حذف ہوگیا۔ جس پرچہ پر نام لکھ کر بھیجا تھا وہ گم ہوگیا یا کیا ہوا۔؟

آنجناب کے گرامی نامہ سے الحمدللہ طبیعت پر اتنا اثر ہوا کہ نظرِ ثانی کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ (الخ مختصراً)

محتاجِ دعا

انیس احمد عفی عنہٗ ۳۰ ستمبر ۹۴ء

بشکریہ ماہنامہ "الخیر"

خوشی کی بات ہے کہ کتاب "اصلاحِ مفاہیم" کے مترجم مولوی انیس احمد مظاہری نے مذکورہ بالا مکتوب میں موجود غلط باتوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ اگرچہ یہ امر باعث تعجب ہے کہ جن باتوں کا مولوی انیس احمد صاحب نے ذکر کیا ہے وہ کتاب میں شائع ہونے سے کیونکر رہ گئیں، لیکن بہرحال ادارہ انوارِ مدینہ توقع کرتا ہے کہ مولوی انیس احمد مظاہری (مترجم) مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ہزاروی (جنہوں نے اصلاح مفاہیم پر پُرزور تائیدی تقریظ لکھی ہے) مولانا احمد عبد الرحمٰن صدیقی صاحب (جن کے نام سے کتاب کا مقدمہ شائع ہوا ہے) اور جناب صوفی اقبال صاحب (جنہوں نے یہ کتاب چھپوائی اور مولانا تقی عثمانی صاحب کے تبصرہ کو اصل قرار دیا) اس کتاب میں موجود غلط باتوں سے برملا رجوع کرتے ہوئے اس کتاب سے برائت کا اعلان کریں گے۔

نیز ادارہ یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ یہ حضرات اپنے سابقہ رسالہ "اکابر کا مسلک و مشرب" سے بھی رجوع و برئیت کا اعلان فرمائیں گے۔ اہلِ حق کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے بلا خوفِ لومۃ لائم علی الاعلان رجوع فرما لیتے ہیں۔ اس طرح یہ حضرات اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب روشن کریں گے تاکہ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ کتاب پہنچ چکی ہے وہ اپنے عقیدے اور عمل کو محفوظ رکھ سکیں۔ (ادارہ انوارِ مدینہ)

## انوارِ مدینہ

نہ پہنچنے یا تاخیر سے پہنچنے کی شکایت حافظ محمد یعقوب صاحب خادمِ "انوارِ مدینہ" جامعہ مدنیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور سے کی جائے، خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا جائے۔ (ادارہ)

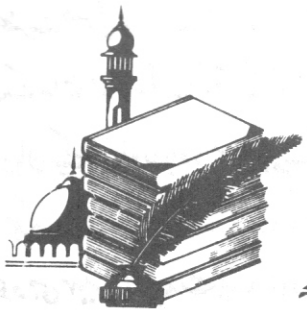

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں۔

# تعارف و تنقید

مختلف تبصرہ نگاروں کے قلم سے

نام کتاب: معالم العرفان فی دروس القرآن (جلد نمبر ۱۴)

افادات: حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی دامت برکاتہم

مرتّب: الحاج لعل دین ایم اے۔

صفحات: ۸۰۸

ناشر: مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت: ۲۰۵/- روپے

"انوارِ مدینہ" کے گزشتہ شمارے میں "معالم العرفان" کی تیرھویں جلد پر تبصرہ گزر چکا ہے جس میں ذکر کیا گیا تھا کہ "معالم العرفان" حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم کے درسی افادات ہیں جن کی حیثیت مستقل ایک تفسیر کی بن گئی ہے جس میں تفسیر قرآن کا ذوق رکھنے والوں کے لیے ہر قسم کے معارف و مسائل، رموز و نکات اور قدیم و جدید معلومات موجود ہیں۔ نیز اس میں مستشرقین کے اعتراضات کا دفعیہ بھی ہے اور اسلامی اقدار کا دفاع بھی ہے۔ انداز انتہائی دلکش، آسان اور دل میں اُترنے والا ہے۔

حضرت صوفی صاحب کا انداز اس تفسیر میں یہ ہے کہ آپ جب کسی سورت کی تفسیر شروع فرماتے ہیں تو اس سورت میں بیان کیے جانے والے تمام مضامین اجمالی طور پر شروع ہی میں بتلا دیتے ہیں، سورت کا شانِ نزول وقتِ نزول اور محلِ نزول نیز سُوَر و آیات کا باہمی ربط بھی واضح فرماتے ہیں کہیں کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس کی تفصیل اور کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو اس کی مدلّل تشریح بیان فرماتے ہیں۔

حضرت صوفی صاحب دامت برکاتہم نے اس تفسیر میں موجودہ زمانہ کے حالات کا قدیم دَور کے حالات کے ساتھ موازنہ کرکے اُمّتِ مسلمہ کی صحیح رہنمائی فرمائی ہے۔ اعتدال کی راہ پر چلتے ہُوئے تمام مسائل بیان کیے ہیں اور جادۂ مستقیم سے کہیں بھی سرِ مو انحراف نہیں کیا۔ اسلاف کا جو اندازِ تفسیر ہے ٹھیک ٹھیک اسی انداز پر تفسیر کی ہے، ہمارے اس پُر آشوب دَور میں یہ ایسی چیز ہے جو صرف نادر الوجود ہی نہیں بلکہ جدّت پسند اور ماحول سے متأثر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے دُشوار گزار بھی ہے۔

اس تفسیر کی ایک بڑی خُوبی یہ بھی ہے کہ یہ نہ انتہائی مختصر ہے کہ قاری پڑھ کر سیر نہ ہو اور نہ ہی اتنی طول وطویل ہے کہ پڑھنے والا اُلجھ کر رہ جائے اور اُکتانے لگے بلکہ خَیْرُ الْکَلَامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ کا صحیح مصداق ہے۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر "معالم العرفان" کی چودہویں جلد ہے، اس جلد میں درج ذیل سات سورتوں کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ سورۂ لقمان[۱]، سورۂ الم السجدۃ[۲]، سورۃ الاحزاب[۳]، سورۂ سبا[۴]، سورۂ فاطر[۵]، سورۂ یٰسین[۶]، سورۃ الصّٰفّٰت[۷]۔

انتہائی عمدہ کتابت وطباعت اور ڈائی دار جلد کے ساتھ مزیّن مناسب نرخ پر تفسیر کی یہ چودہویں جلد مارکیٹ میں دستیاب ہے، قرآن فہمی کا ذوق رکھنے والے اس سے استفادہ کرکے اپنے ذوق کو تسکین بخشیں۔

ن - ا

اِس دینی رسالہ سے آپکا تعاون آپ کے اَجر اور اسکے استحکام، بقاء، اور ترقی کا باعث ہوگا۔

★ اِس کے خریدار بنیئے اور دوسروں کو خریدار بنائیے۔
★ اِس میں اشتہار دیجئے اور دوسروں سے دلوائیے
★ اِس کے لیے مضامین لکھیئے اور اپنے مضمون نگار دوستوں کو اس کیلئے مضمون لکھنے کی ترغیب دیجئے۔

ماہنامہ انوار مدینہ لاہور